حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

# سب رس

مارچ 2018ء
-/30روپے

ISSN-2278-6902

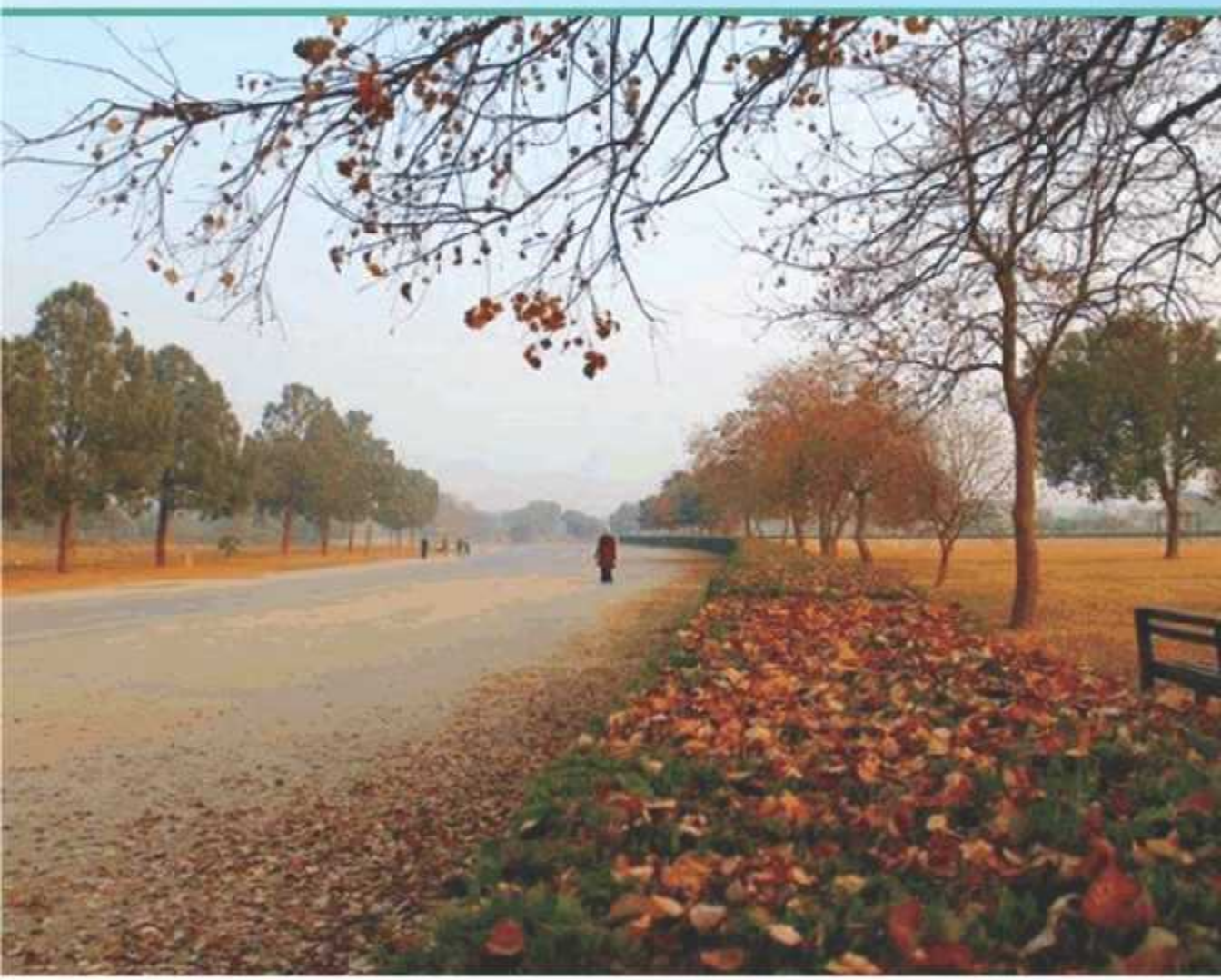

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

ڈاکٹر آمنہ تحسین کی کتاب ''میدر آباد میں اردو کا نسائی ادب'' کی رسم اجراء بہ دستِ پروفیسر ایس۔اے۔شکور، ڈائریکٹر / سکریٹری، تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکادمی کے ہاتھوں انجام دی گئی۔ تصویر میں (دائیں سے بائیں) جناب اسلم فرشوری، ڈاکٹر آمنہ تحسین، پروفیسر ایس۔اے۔شکور، پروفیسر بیگ احساس، (مہمان خصوصی) پدم شری مجتبیٰ حسین (صدر جلسہ)، پروفیسر اشرف رفیع (مہمان خصوصی)، محترمہ قمر جمالی، پروفیسر فاطمہ بیگم، پروفیسر نسیم الدین فریس اور جناب انیس احسن اعظمی (مہمانِ اعزازی)

پروفیسر بیگ احساس، جناب چندر شیکھر کمبار، صدر، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے ہاتھوں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ قبول کرتے ہوئے۔ نائب صدر، ساہتیہ اکادمی، جناب مدھوکوشک، مہمان خصوصی مراٹھی اور انگریزی کے نامور ادیب و اسکالر جناب کرن ناگر کر اور دیگر ایوارڈ یافتگان دیکھے جاسکتے ہیں۔

بیادگار سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

# سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ شمارہ: ۳ ماہ: مارچ سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی

❁ صدر: جناب زاہد علی خاں

❁ معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِسالانہ

❁ ہندوستان: **300روپے**

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600روپے

قیمت: **-/30**

❁ کتب خانوں سے: **400روپے**

❁ مغربی و عرب ممالک سے 60ڈالر یا 40پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد .082 500 انڈیا

برقی پتہ: ***E-mail: idarasabras@yahoo.in***

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

**بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60روپے زیادہ**

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

# کلونجی

## خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
مند پسند اور
آزمودہ نسخہ

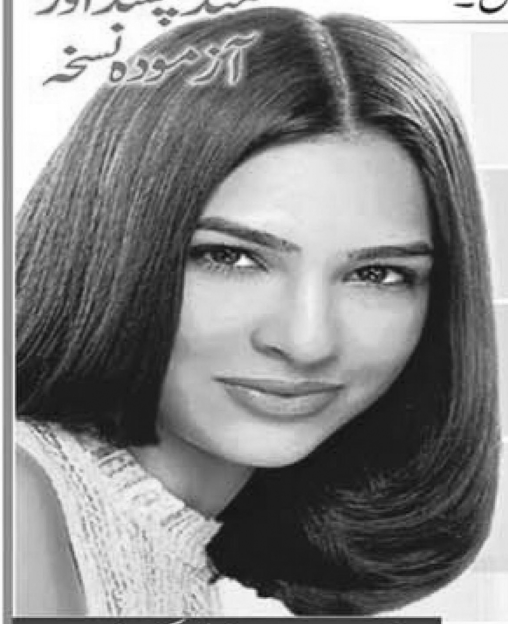

**زم زم بہار ہیئر آئیل**
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

**کلونجی فیرنس کریم**
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

**کلونجی پمپل کریم**
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

**کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر**
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ، میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

## ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

# اس شمارے میں


**اداریہ**

| | | |
|---|---|---|
| خون آشام..... شام؟ | بیگ احساس | 6 |

**مضامین**

| | | |
|---|---|---|
| مجتبیٰ حسین کا فن ''آخر کار'' کی روشنی میں | عبدالوہاب قاسمی | 9 |
| نسائی شاعری کا لہولہو منظر نامہ | حلیمہ فردوس | 21 |
| انتظار حسین کا آخری آدمی: تقلیبِ آدم کا بیانیہ | مسرت جہاں | 29 |
| شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کی ناقدانہ بصیرت | زاہدالحق | 34 |

**رپورتاژ**

| | | |
|---|---|---|
| ایوارڈ یاترا | بیگ احساس | 43 |
| یادیں | راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرا/اشرف رفیع | 50 |

**طنز و مزاح**

| | | |
|---|---|---|
| ادب اور ازدواجی مسائل | خامہ بگوش | 55 |

**شاعری**

| | | |
|---|---|---|
| احسن رضوی، کوثر صدیقی، ستار صدیقی، جنوں اشرفی، جمال اویسی، | شارق عدیل، رفیق جعفر، نسیم محمد جان | 58 |

**افسانے**

| | | |
|---|---|---|
| تحت الثریٰ | نسیم بن آسی | 66 |
| تصویر ہمارے سامنے ہے | محبوب پاشا اعظمی | 71 |

**خراج عقیدت**

| | | |
|---|---|---|
| کھلی کتاب/اقدیر زماں | رؤف خیر | 76 |

**جو وہ لکھیں گے جواب میں**

| | | |
|---|---|---|
| کوثر صدیقی، اسیم کاویانی، نسیم محمد جان، شارق عدیل | کشور سلطانہ، مسعود جعفری، احسن رضوی، جنوں اشرفی | 80 |

# اداریہ

## خون آشام.....شام؟

مشرقِ وسطی جب سے تیل کے دولت سے مالا مال ہوا ہے دنیا کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا ہے۔عرب اسرائیل جنگ، ایران۔عراق جنگ،عراق۔کویت جنگ، پھر ایک بعد ایک عرب ملکوں کا صفایا۔جس نے سر اُٹھایا اسے ختم کر دیا گیا۔نیوکلیر ہتھیار کے بہانے عراق کو ختم کر دیا گیا۔پھر لیبیا بھی ختم ہوا۔مصر میں منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔لاکھوں افراد کا خون بہایا گیا اور اب شام میں یہ خون ریزی جاری ہے۔یہ سلسلہ 2011ء سے شروع ہوا اور اس کے رکنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔8 لاکھ افراد ظالم بشار الاسد اور اس کے حلیفوں کے ہاتھوں موت کا شکار ہو چکے ہیں۔درعا، دیرالزور، حلب اور اب غوطہ دمشق میں خون ریزی جاری ہے۔لاکھوں معصوم بچے اپنے ماں باپ اور گھر سے محروم ہو چکے ہیں۔اس درندگی کی علامت ایلان کردی، اور ملبے میں دبا ہوا احمد بن چکے ہیں، چھ برس میں پچاس ہزار سے زیادہ معصوم بچے مارے گئے ہیں۔میڈیا پر کٹے پھٹے اعضا کے ساتھ خون آلود اجسام....!! بے سہارا معصوم بچوں کی چیخ و پکار، اپنے معصوم بچوں کی لاشوں کو ہاتھوں میں اٹھائے درد سے چیختے ہوئے ماں باپ، زخمی چہرے لیے عورتیں۔دودھ پیتے بچوں کے چہرے خون سے تر ہیں۔یہ مناظر دیکھے نہیں جاتے۔لیکن شام میں ظلم و تشدد کا طوفان ہے۔ہر شخص لہولہان ہے۔عمارتیں مٹی کا ڈھیر ہوگئی ہیں۔عبادت گاہیں شہید ہوگئیں۔اسپتال زمیں دوز ہو گئے۔کھلے آسمان سے نہتے عوام پر بمباری کی جارہی ہے۔ایک کڑوڑ چالیس لاکھ لوگ ملک چھوڑ کر ہجرت کر چکے۔انھیں کوئی اپنانے کے لیے تیار نہیں۔زندگی کی تلاش میں وہ اللہ کی بنائی ہوئی زمین پر ٹھکانہ تلاش کر رہے ہیں۔لاکھوں انسان اپنا گھر تجارت اور ملازمت چھوڑ کر زندگی بچانے کے لیے فرار ہو چکے ہیں۔صرف ترکی ہی ایسا ملک ہے جسے ان پناہ گزینوں سے ہم دردی ہے۔غوطہ دمشق میں قیامت کا منظر ہے۔بموں اور شل بازی سے زمین کانپ رہی ہے اور بموں کے دھوئیں سے آسمان سیاہ ہو گیا ہے۔پورا شہر ملبہ میں تبدیل ہو رہا ہے۔اقوام متحدہ نے ایک ماہ کی جنگ بندی کی قرارداد منظور کی۔لیکن اس پر عمل درآمد کروانے کی اس میں طاقت نہیں۔طاقت ور ممالک اقوام متحدہ کی قراردادوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے اپنی من مانی کرتے ہیں۔سب تماشائی ہیں۔کسی میں عمل کی طاقت نہیں کوئی بڑی طاقتوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا تو دور کی بات ہے منہ تک نہیں کھول سکتا۔

ایک طرف عرب ممالک ہیں۔جو سرزمین مقدس میں امریکی کلچر کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔غریب ممالک سے آکر جن لوگوں نے برسوں یہاں ملازمتیں کیں۔عمارتیں کھڑی کیں۔اپنا خون پسینہ بہایا۔ان کو یکلخت یہاں سے بھگایا جارہا ہے۔جو لوگ باقی بچے ہیں ان پر عرصہ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔خلیجی تعاون کونسل یا عرب لیگ کی جانب سے کوئی مذمتی بیان تک جاری نہیں کیا گیا۔عرب اپنے

شبستان عیش میں خوش اور مگن ہیں۔ظالم بشار الاسد اپنے اقتدار کے لیے جو کچھ کر رہا ہے اسے روس اور ایران کی تائید حاصل ہے۔ یہاں بات کسی خاص قوم کسی خاص مذہب اور کسی خاص نسل کی نہیں ہے۔بات انسانیت کی،ظلم وتشدد کی ہے،خون ریزی کی ہے،ترقی یافتہ دور میں انسان کب تک وحشت اور بربریت کا مظاہرہ کرتا رہے گا؟ کیا ظالموں کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔آخر یہ خون ریزی کیوں جاری ہے؟ کب تک یہ سلسلہ چلے گا۔غیر جانب دار ممالک اسے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے خاص طور پر ہندوستان جو مستقبل کی بڑی طاقتوں میں شامل ہوجائے گا اپنا احتجاج درج کیوں نہیں کرواتا؟ ہمارے وزیر آعظم جو دنیا بھر میں اپنا ایک وزن ووقار رکھتے ہیں ان سے گذارش ہے کہ وہ اس جانب توجہ دیں اور اس جنگ کو روکنے میں مثبت رول ادا کریں۔

# بیگ احساس

## اعلان بہ حکم پریس رجسٹرار حکومت ہند

(فارم:۴،رول نمبر۸)

| | |
|---|---|
| بابت: | ''سب رس'' |
| وقفہ اشاعت: | ماہ نامہ |
| پرنٹر،پبلیشر کا نام: | پروفیسر ایس۔اے۔شکور |
| قومیت: | ہندوستانی |
| ایڈیٹر: | پروفیسر بیگ احساس |
| قومیت: | ہندوستانی |
| مقامِ اشاعت: | ''ادارۂ ادبیات اردو'' ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ،سوماجی گوڑہ،حیدرآباد۔۵۰۰۰۸۲ |
| نام و پتہ مالک: | ''ادارۂ ادبیات اردو'' ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ،سوماجی گوڑہ،حیدرآباد۔۵۰۰۰۸۲ |

میں پروفیسر ایس۔اے۔شکور تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

پروفیسر ایس۔اے۔شکور

تاریخ

۱۵/مارچ ۲۰۱۸

# مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
# मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
# Maulana Azad National Urdu University

مرکزی یونیورسٹی جسے نیشنل اسسمنٹ اینڈ ایکریڈیشن کونسل سے ''اے گریڈ'' حاصل ہے

# اعلان داخلہ

یونیورسٹی میں تعلیمی سال 19-2018 کے لیے مرکزی کیمپس حیدرآباد اور دیگر سٹیلائٹ کیمپسوں، کالجس آف ٹیچر ایجوکیشن (سی ٹی ایز) اور پالی ٹیکنیکس کے لیے ریگولر پروگرامس پی ایچ ڈی، پوسٹ گریجویشن، انڈر گریجویشن اور ڈپلوما و سرٹیفکیٹ کورسز میں داخلے کے لیے **آن لائن درخواستیں** مطلوب ہیں۔

**پُر کردہ آن لائن درخواستوں کے ادخال کی آخری تاریخ**

## 26.3.2018 انٹرنس ٹسٹ کے ذریعہ داخلے

**پی ایچ ڈی** : اردو، انگریزی، ہندی، عربی، فارسی، مطالعات ترجمہ؛ مطالعات نسواں، پبلک ایڈمنسٹریشن، سیاسیات، سوشل ورک، اسلامک اسٹڈیز، تاریخ، معاشیات، سوشیالوجی؛ تعلیم؛ صحافت وترسیل عامہ؛ مینجمنٹ، کامرس؛ ریاضی، حیوانیات؛ کمپیوٹر سائنس۔

**پوسٹ گریجویٹ پروگرام**: ایم اے (عربی)؛ ایم بی اے؛ ایم سی اے، ایم ٹیک (کمپیوٹر سائنس) اور ایم ایڈ

**انڈر گریجویٹ پروگرام**: بی ایڈ اور بی ٹیک (کمپیوٹر سائنس)۔

**پیشہ ورانہ ڈپلوما**: ایلمنٹری ایجوکیشن (ڈی ایل ایڈ)؛ سیول انجینئرنگ، کمپیوٹر سائنس انجینئرنگ، الیکٹرانکس اینڈ کمیونی کیشن انجینئرنگ اور انفارمیشن ٹکنالوجی

## 09.7.2018 میرٹ کے ذریعہ داخلہ

**پوسٹ گریجویٹ پروگرام**: اردو، انگریزی، ہندی، مطالعات ترجمہ، فارسی؛ مطالعات نسواں، پبلک ایڈمنسٹریشن، سیاسیات، سوشل ورک، اسلامک اسٹڈیز، تاریخ، معاشیات، سوشیالوجی؛ ایم اے (صحافت وترسیل عامہ)؛ ایم کام اور ایم ایس سی (ریاضی)۔

**انڈر گریجویٹ پروگرام**: بی اے، بی اے (آنرس)۔ جے ایم سی، بی کام، بی ایس سی (طبیعی علوم-ایم پی سی) / بی ایس سی (طبیعی علوم-ایم پی سی ایس) اور بی ایس سی (حیاتی علوم-زیڈ بی سی)۔

**برج (رابطہ) کورسز**: مدارس کے فارغ طلبہ کے لیے برائے داخلہ انڈر گریجویٹ (بی کام/ بی ایس سی) اور پالی ٹکنک پروگرام۔

**پی جی ڈپلوما اور ڈپلوما پروگرام**: پی جی ڈپلوما ان اسلامک بینکنگ، پی جی ڈپلوما ان رئیل مینجمنٹ، آئی ٹی آئی طلبہ کے لیے پالی ٹکنک میں لیٹرل انٹری۔

**جز وقتی ڈپلوما پروگرام**: اردو، ہندی، عربی، فارسی اور اسلامک اسٹڈیز۔

**نوٹ:**

- تمام درخواست گزاروں کے لیے لازمی ہے کہ وہ کم از کم دسویں/ بارہویں/ ڈگری میں اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کر چکے ہوں یا بحیثیت زبان/مضمون اردو کامیاب ہوں یا مصرحہ مدرسوں سے فارغ ہوں (مدرسوں کی فہرست ای-پراسپکٹس میں دی گئی ہے)۔ تمام پروگراموں کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔
- تمام پروگراموں میں داخلے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے صدر مرکز حیدرآباد پر دستیاب ہیں الا یہ کہ علاحدہ تذکرہ کیا گیا ہو۔

**دیگر کیمپسس پر دستیاب پروگرامس:**

1. لکھنو کیمپس: اردو، فارسی، انگریزی اور عربی کے بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی پروگرام۔
2. سری نگر کیمپس: معاشیات، اسلامک اسٹڈیز، اردو اور انگریزی کا ایم اے اور اسلامک اسٹڈیز کا پی ایچ ڈی پروگرام۔
3. کالج آف ٹیچر ایجوکیشن بھوپال (مدھیہ پردیش)، سری نگر (جموں وکشمیر)، دربھنگ (بہار): بی ایڈ، ایم ایڈ اور پی ایچ ڈی ان ایجوکیشن۔
4. کالج آف ٹیچر ایجوکیشن آسنسول (مغربی بنگال)، اورنگ آباد (مہاراشٹرا)، سنبھل (اتر پردیش)، نوح (ہریانہ) اور بیدر (کرناٹک): **بی ایڈ۔**
5. **پالی ٹیکنک انجینئرنگ ڈپلوما:** سیول انجینئرنگ؛ کمپیوٹر سائنس انجینئرنگ، الیکٹرانکس اینڈ کمیونی کیشن انجینئرنگ کے ڈپلوما (دربھنگہ۔ بہار اور بنگلورو۔ کرناٹک)؛ سیول انجینئرنگ، میکانیکل انجینئرنگ، الیکٹریکل اور الیکٹرانکس انجینئرنگ، اپیرل انجینئرنگ (کڑپہ۔ آندھرا پردیش)؛ سیول انجینئرنگ، میکانیکل انجینئرنگ، الیکٹریکل اور الیکٹرانکس انجینئرنگ اور آٹو موبائل انجینئرنگ (کٹک - اڈیشہ) پر دستیاب ہیں۔

* **دیگر کیمپسس کے لیے بھی تمام پی ایچ ڈی، بی ایڈ، ایم ایڈ اور پالی ٹیکنک انجینئرنگ ڈپلوما پروگرامس میں داخلہ بذریعہ انٹرنس ٹسٹ ہی ہوں گے۔**

درخواستیں صرف آن لائن ہی قبول کی جائیں گی۔ تمام پروگراموں کے لیے ای۔ پراسپکٹس اور آن لائین درخواست فارم 18/فروری 2018 سے داخلوں کی آخری تاریخ تک یونیورسٹی ویب سائٹ پر دستیاب رہیں گے۔ تفصیلات یا کسی وضاحت کے لیے نظامت داخلہ کو admissionsregular@manuu.edu.in پر ای میل کریں۔

ایس سی/ ایس ٹی/ او بی سی/ معذور امیدواروں کیلئے مختلف پروگراموں میں داخلے کیلئے تحفظات حکومت ہند کے ضوابط کے مطابق رہیں گے۔ یونیورسٹی میں ہاسٹل کی محدود گنجائش فراہم ہے۔

**رجسٹرار**

تاریخ: **16.2.2018**

**www.manuu.ac.in**

عبد الوہاب قاسمی

مضمون

# مجتبیٰ حسین کا فن ''آخر کار'' کی روشنی میں

اردو طنز و مزاح کی روایت میں مجتبیٰ حسین کی شخصیت ایک نمایاں کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا شمار ایسے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جن کے یہاں دانشورانہ فکر کے ساتھ اپنی تخلیقات کو پیش کرنے کا ایک سلسلہ رہا ہے۔ پچھلی چند دہائیوں سے انھوں نے اپنے قاری کا جو وسیع حلقہ بنایا اس میں ان کی تخلیقات کی فکر انگیزی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دائرے میں قاری کے اس حلقے کے افراد بھی اچھی تعداد میں شامل ہیں جن کی شناخت ایک دانشور کے طور پر ہوتی ہے جنھیں نقادوں کا حلقہ کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس حلقے کو متوجہ کرنے کا دارومدار کسی بھی فنکار کی فنی تہہ داری اور تخلیقی شعور کی پختگی پر ہے۔ وقفے وقفے سے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر جو کتابیں منظرِ عام پر آرہی ہیں یا ان کی تخلیقات کے جو انتخابات شائع ہو رہے ہیں وہ اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ مجتبیٰ حسین کے تئیں یہ حلقہ کس قدر سرگرمِ عمل ہے۔

''آخر کار'' کے مطالعے سے ان کی اس دانشورانہ سوچ کی پرتیں قاری پر کچھ اس طرح کھلتی ہیں کہ وہ مجتبیٰ حسین کے فن سے نہ صرف محظوظ ہوتا ہے بلکہ فن کار کی شعوری تکنیک سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس کتاب میں شامل اکیس مضامین یوں تو الگ الگ موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں مگر ہر جگہ فن کار کی سوچ، اس کی فکر، اس کا نظریہ اور تخلیقی آئیڈیالوجی فنّی ہنرمندی کے ساتھ طنز و مزاح کے پیکر میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ صرف طنز و مزاح کے مشہور حربوں سے کام لینا ہی ایک بڑے فن کار کا شناخت نامہ نہیں بلکہ ان میں ذہنی تجلی، فکری گیرائی اور صورتِ حال سے مکمل ہم آہنگی کے نئے امکانات تلاش کرنا بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ مجتبیٰ حسین کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ظرافت کے حربوں کے استعمال میں مذکورہ تینوں باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بین السطور اور پس منظر میں ہمیں وہ باتیں بہت واضح طور پر نظر آجاتی ہیں جو ان کا اصل مقصود ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو یہی ''ان کہی'' طنز و مزاح کی روح ہے۔ ظرافت نگار ''کہی'' کے پردے میں ''ان کہی'' کی جو لکیریں کھینچتا چلا جاتا ہے اگر ان تک ہمارا ذہن نہیں جا سکتا تو ہم ظرافت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ظرافت نگار کے اصل پیغام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی باتیں اشاروں اشاروں میں کہہ جائے گا مگر ہم ظرافت کے ظاہری پہلو یعنی ہنسنے ہنسانے تک ہی محدود ہو کر رہ جائیں گے۔

''آخر کار'' کے مشتملات پر غور کرتے ہوئے یہ بات بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ مجتبیٰ حسین بین السطور کو بڑی محنت، مشاقی اور فنی مہارت سے ترتیب دیتے ہیں۔ جہاں ہم پڑھتے کچھ ہیں اور شعوری لہر میں اترتا کچھ اور ہے۔ ظرافت کی معیاری صورت بھی یہی ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے قاری کو ذہنی تبسم کے ساتھ اس کی سوچ میں تحرک پیدا ہو۔ یہ خوبی مجتبیٰ حسین کے فن میں کسی برقی لہر کی طرح موجود ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں:

> ☆''چنانچہ جب میں لائبریری کے اردو سکشن میں داخل ہوا تو یوں لگا جیسے میں کسی بھوت بنگلہ میں داخل ہو گیا ہوں۔ میں خوفزدہ سا ہو گیا۔ لیکن ڈرتے ڈرتے میں نے گرد میں اٹی ہوئی ''کلیاتِ میر'' کھولی تو دیکھا کہ اس میں سے ایک موٹی تازی دیمک بھاگنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں اسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک دیمک نے کہا ''خبردار! جو مجھے

ہاتھ لگایا تو۔ میں دیمکوں کی ملکہ ہوں۔ باادب باملاحظہ ہوشیار۔ ابھی ابھی محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' کا خاتمہ کرکے یہاں پہنچی ہوں۔ جس نے ''آبِ حیات'' پی رکھا ہو اسے تم کیا مارو گے۔ قاتل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم'' ('دیمکوں کے ملکہ سے ایک ملاقات' ص ۸)

☆ ''برسہا برس بیت گئے مگر میں نے اس ندی میں کبھی پانی کو بہتے ہوئے نہیں دیکھا'' میں نے پوچھا ''پھر اس شہر کے لوگ اپنی پیاس کس طرح بجھاتے ہیں؟'' جہانگیر علی بولا ''حضور اس کے لیے اس شہر میں ایک محکمہ آبرسانی موجود ہے جس کا کام نلوں سے نہیں بلکہ اس شہر کے باسیوں کی آنکھوں کے ذریعہ پانی سربراہ کرنا ہے۔ لوگ دو دو تین تین دن انتظار کرتے ہیں تو اس شہر کے نلوں میں پانی کے چار پانچ قطرے نکل آتے ہیں۔ البتہ عوام کی آنکھوں کا پانی کبھی نہیں سوکھتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس شہر کے حکمرانوں کی آنکھوں کا پانی مرگیا ہے''

(سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سفرنامہ: ص ۳۳ تا ۳۴)

☆ ''ایک زمانہ تھا جب گھر کے نقشہ میں باتھ روم ایسا ہی ہوتا تھا جیسے دنیا کے نقشہ میں آسٹریلیا۔ بالکل الگ تھلگ۔ مگر اب باتھ روم ہی اصل گھر نظر آنے لگا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے ایک اخبار میں اشتہار پڑھا جس میں لکھا تھا ''ضرورت ہے ایک خوش نما بڑے باتھ روم کی، اس کے ساتھ اگر ایک اٹیچڈ بیڈروم ہو تو ٹھیک رہے گا۔ نہ ہو تو بھی چلے گا''۔ میں نے سوچا تھا اشتہار دینے والا یقیناً پیٹ کی کسی بیماری کا مریض ہوگا مگر اب پتہ چلا کہ بڑا آدمی تھا۔ پیٹ بڑا بدکار ہے۔ پیچش کے مریض اور بڑے آدمی دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے''

(صاحب باتھ روم میں ہیں: ص ۲۳)

مذکورہ اقتباسات میں سارا فسوں بین السطور میں ابھرنے والی لہروں کا ہے جن میں طنز کی شدت کسی باریک سوئی چبھونے جیسی ہے۔ ان اقتباسات میں جس سنجیدگی اور شایستگی سے ہماری زندگی کے المناک اور افسوسناک پہلوؤں پر نشانے سادھے گئے ہیں وہ ظرافت نگار کی فکری بالیدگی سے معمور ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی سوچ میں غرق ہے اور اندرونی اضطراب کے ساتھ مسلسل صبر آزما مرحلوں سے گزر رہا ہے۔ اسی لیے ہماری خامیوں اور کوتاہیوں کو دیکھ کر وہ اپنے اندرونی ہیجان سے مغلوب ہوئے بغیر اظہار کی ایسی تکنیک کا سہارا لیتا ہے جس میں ملائمت اور ہمدردی تو ہے مگر بین السطور میں طنز کے چراغ روشن ہیں۔ ان کوتاہیوں کو جب ایک حساس فنکار اپنی ننگی آنکھوں سے دیکھے گا تو ظاہر ہے اس کے اندرونی ارتعاشات اسے بے چین کریں گے۔ شاید یہی وہ وقت ہوتا ہے جب تخلیقی ردِ عمل ظاہر کرتے وقت کچّے فن کار اپنا توازن کھو دیتے ہیں اور جوش، غصہ اور چڑچڑے پن کی وجہ سے فکری تہہ داریاں مجروح ہوتی ہیں۔ سنجیدہ تحریروں میں اسے کسی حد تک ''مزاحمتی تحریر'' کی آڑ میں گوارا تو کیا جاسکتا ہے مگر ظرافت اسے قبول نہیں کرسکتی۔ کیوں کہ یہاں فکری تہہ داری اور ہمدردانہ اسلوب ہی قابلِ قبول ہے۔ مجتبیٰ حسین

نے اپنی بے کلی کو تخلیقی ردِعمل سے مربوط کرتے ہوئے مفکرانہ طور پر اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں طنز طرح دار ہو گیا ہے۔ آخر کے دو اقتباسات میں تشبیہ اور مبالغے کے ذریعے طنز کو معنوی تہہ داری اور گہری تخلیقیت سے مملو کر دیا گیا ہے۔ دوسرے اقتباس کے عبرتناک منظر کی تہہ میں شدید کرب اور روح فرسا طنز کو پینے کے پانی سے لے کر آنکھوں کے پانی تک معنوی وسعت بخش دی گئی ہے۔ عوام کی آنکھوں کا پانی بے بسی اور بے کسی کی تعبیر بن کر سامنے آتا ہے جبکہ حکمرانوں کی آنکھوں کا پانی بے حیائی اور بے شرمی کی تفسیر بن جاتا ہے۔ ایک محاورے کے استعمال سے مجتبیٰ حسین نے جو کام لیا ہے وہ ان کا انفراد ہے۔

آخری اقتباس میں ''باتھ روم'' کو آسٹریلیا سے تشبیہ دے کر بیڈ روم سے الگ کرنے کی بات ضرور مزاح کو تحریک دیتی ہے مگر اشتہاری خبر میں مبالغے کا اصل نشانہ بڑے آدمی کی ''رشوت خوری'' پر سادھا گیا ہے ''پیٹ بڑا بدکار ہے'' پر ذرا غور کیجیے تو اس کا راز افشا ہوتا ہے۔ لفظ ''پیچش'' کو بولتے ہی بار بار باتھ روم میں جانے کا تصور ابھرتا ہے ''رشوت'' میں بھی یہی تسلسل موجود ہے کہ انسان ایک بار لیتا ہے تو بار بار لینے کی لت پڑ جاتی ہے۔ باتھ روم اور رشوت میں ایک معنوی مماثلت یہ بھی ہے کہ دونوں کا معاملہ پردے کا ہے اسی طرح کراہیت میں بھی دونوں متوازی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بڑا آدمی اور رشوت میں بڑا گہرا تعلق ہے کیونکہ عام تنخواہ سے بڑے آدمی بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں واقعاتی پیکر تراشی اور قصہ گوئی کی خاص اہمیت ہے۔ قصہ در قصہ کی افسانوی تکنیک سے وہ ظرافت کے پہلو نکالتے ہیں اور کرداروں کو مخصوص فضا سے ہم آہنگ کر کے اپنی تحریر میں دلچسپی کے عناصر پیدا کرتے ہیں۔ موقع اور محل کے مطابق کردار، واقعات اور مشاہدات و تجربات کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے اپنی تخلیقات میں فطری پن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے یہاں یہ احساس ہوتا ہے کہ فنکار محض قصہ گوئی کے لیے قصے نہیں سنا رہا ہے بلکہ وہ ان کے منظر و پس منظر میں انسانی زندگی کے نفرت انگیز پہلوؤں اور کرداروں کے منفی رویے کو دانشمندی سے ہمارے روبرو کر رہا ہے۔ ان کے پیش کردہ واقعات اور کردار میں برجستگی کی جو کیفیت ہے اس سے بھی لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان کی برجستگی میں عجلت پسندی کے ساتھ کسی بھی اسلوب میں کچھ بھی کہہ دینے سے گریز ملتا ہے۔ وہ برجستگی کو نثر کی چستی میں ڈھالتے ہیں اسی لیے ان کی ظرافت نگاری بھونڈے الفاظ، سپاٹ فقروں اور بے معنیٰ لطیفوں سے پاک ہے۔ کچھ واقعات ملاحظہ کیجیے:

☆ ''مالک مکان ہونے کا سب سے بڑا فائدہ ہمیں یہی نظر آیا کہ مکان کے کرایے میں اضافہ کر کے مالک مکان ہر قسم کے غم کو برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ نئے سال کے پرمسرت ماحول میں ہم کسی کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا کرایہ میں اضافہ کی بات مان لی۔ تاہم ڈرتے ڈرتے مکان مالک سے دست بستہ عرض کی کہ حضور! وہ جو ہم نے دو سال پہلے کی پہلی جنوری کو مکان کی سفیدی کرانے کی درخواست کی تھی تو اس کا کیا ہوا؟ بولے ''اگلے سال جب میں نئے سال کی مبارک باد دینے آؤں تو ضرور یاد دلایئے گا۔ انشاءاللہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو ہی جائے گا''

(تجھے اے جنوری ہم دور سے پہچان لیتے ہیں: ص ۵۷)

☆ ''ہمارا ایک مشاہدہ یہ بھی ہے کہ عموماً افطار پاٹیوں میں وہی لوگ شرکت کرتے ہیں جو روزہ نہیں رکھتے۔ اس کا ثبوت ہمیں اس

طرح ملا کہ ایک افطار پارٹی میں کئی ارکان پارلیمنٹ شریک تھے جنھیں حالیہ بجٹ پر بحث میں حصہ لینے کی خاطر فوراً پارلیمنٹ واپس جانا تھا۔ میزبان نے جب دیکھا کہ اکثر ارکانِ پارلیمنٹ کچھ کھائے پیے بغیر ہی واپس جانے کے خواہش مند ہیں تو انھوں نے اعلان کیا کہ جو لوگ روزہ دار نہیں ہیں اور جو کسی مجبوری کے تحت جلدی واپس جانا چاہتے ہیں وہ چاہیں تو افطار کے وقت سے پہلے ہی کچھ کھالیں۔ ان سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ اس اعلان کا عام ہونا تھا کہ سارے لوگ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب افطار کا اصل وقت آیا تو معزز میزبان تک موجود نہیں تھے'' (افطار پاٹیوں کا دوردورہ: ص۲۷)

ان واقعات میں طنز کی گہری معنویت موجود ہے۔ یہاں طنز کا نشتر انسان کے زوال پذیر کردار کی تہہ میں اتر گیا ہے اور ایسے کی دردناک پرچھائیاں پورے سماج پر محیط ہو گئی ہیں۔ کردار کے عملی تضاد کو پیش کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین نے جس معروضیت سے کام لیا ہے اس میں المناک صورتِ حال موجِ تہہ نشیں کی طرح سامنے آتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کے یہاں غیر مرئی اور جامد اشیا جب کرداروں میں ڈھلتی ہیں تو وہ محسوس اور متحرک ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بے زبان کیڑے بھی ان کے موئے قلم سے بول اٹھتے ہیں۔ ایسے کرداروں کی پیش کش میں ان کا انفراد یہ ہوتا ہے کہ وہ قاری کو مسرت انگیز اور فکر خیز لمحے عطا کرتے ہیں۔ ایسی تحریروں میں وہ ایک طرف واقعات کے تسلسل میں جزئیات نگاری پر دھیان رکھتے ہیں تو دوسری طرف کرداروں کے مکالمے سے ڈرامائیت کے شگفتہ پہلو ابھارتے جاتے ہیں۔

''آخرکار'' میں ''دیمکوں کی ملکہ سے ایک ملاقات''، ''چار مینار اور چار سو برس''، اور ''سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سفر نامہ'' کے عنوان سے لکھے مضامین کی تشکیل مجتبیٰ حسین نے کچھ ایسی ہی جزئیات، ڈرامائی کیفیت، مکالمے اور کرداروں سے کی ہے۔ ان مضامین میں مجتبیٰ حسین کی تخلیقی اپج حیرت انگیز ہے۔ وہ معمولی اشیا کو غیر معمولی کرداروں میں ڈھالنا جانتے ہیں اور ان کی تخلیقی سوچ جب جست لگاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہاں کہاں سے نادیدہ پہلو ڈھونڈ لاتی ہے۔

''دیمکوں کی ملکہ سے ایک ملاقات'' میں مضمون نگار اور دیمکوں کی ملکہ کے مابین جو خوبصورت طنزیہ و مزاحیہ مکالمے ترتیب پاتے ہیں۔ وہ موضوع کی مناسبت سے ہمیں کسک اور چبھن دیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے یہاں اردو ادب پر تنقید کا ایسا نرالہ اور انوکھا اسلوب اپنایا جو زہرناکی کے بھرپور عناصر سے مملو ہونے کے باوجود بھی ہمیں زیرِ لب مسکرانے پر مجبور کرتا ہے۔ انھوں نے لائبریری کے اردو سکشن میں پھیلے سناٹے کو ''بھوت بنگلہ'' سے تشبیہ دے کر پہلے بھرپور طنزیہ فضا قائم کی پھر اس کے پس منظر میں اردو ادب کے زوال کا نوحہ لکھا۔ مطالعہ، نثر، شاعری، کلاسیکی ادب اور کتابوں کے اشاعتی مرحلوں کے لیے جزوی امداد جیسی جزئیات پر ایک دیمک کی زبانی ہماری جو خامیاں بیان کی گئی ہیں ان کی صداقت سے انکار نہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆''میں نے پوچھا ''لیکن تمھیں یہاں سکون کس طرح مل جاتا ہے''
بولی ''ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے اب یہاں کوئی آتا ہی نہیں ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ ساری کتابیں میرے لیے فوڈ کارپوریشن

آف انڈیا کا درجہ رکھتی ہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ تم جواب یہاں آئے ہو تو تم بھی کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں آئے ہو۔ کہیں تم خود مصنف تو نہیں ہو'' (۹)

☆''میں نے کہا''اردو ادب پر تو تمھاری گہری نظر ہے'' بولی''اب جو کوئی اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہی نہیں تو سوچا کہ کیوں نہ میں ہی نظر رکھ لوں'' (۱۱)

مولانا آزاد کی عربی زدہ اردو پر دیمک کا یہ خیال بھی ملاحظہ کیجیے:

☆''اور مولانا آزاد'' بولی''زندگی بھر ٹھاٹ سے عربی لکھتے رہے اور لوگ اسے اردو سمجھ کر پڑھتے رہے۔ عربی کے کسی ادیب کو اردو میں شاید ہی اتنی شہرت ملی ہو'' (۱۱)

''چار مینار اور چار سو برس'' محاکات نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں افسانوی اور ڈرامائی کیفیت سے جو فضا خلق ہوئی ہے اسے پڑھتے ہوئے قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی ڈرامے کے دلکش ماحول کا حصہ بن چکا ہے۔ ماحول کی یہ دلکشی چاروں مینار کے آپسی مکالمے سے قائم ہوتی ہے اور ان میں مزاح نگار نے بڑی ہنرمندی سے معنیٰ خیز اور طنز آمیز پہلو نکالے ہیں۔ چاروں میناروں کی گفتگو کا محور حیدرآباد کی تاریخی کڑیاں اور تہذیبی کروٹیں ہیں۔ چار سو سال پہلے کی تہذیب کا موازنہ آج کی تہذیب سے کچھ اس طرح کیا گیا ہے کہ مضحک پہلو بہت نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ مثالیں دیکھیں:

☆''چار مینار نے کہا کہ''بھیا! انسانوں کے نصب العین بدلتے رہتے ہیں۔ عمارتوں کے نہیں..... تمھیں یاد ہے چار سو برس پہلے جب سلطان قلی قطب شاہ نے ہمیں یہاں کھڑا کیا تھا تو کتنے اعلا نصب العین تھے اس زمانے کے لوگوں کے''

اچانک ایک آواز آئی''اس زمانہ کے لوگوں کے نصب العین اس لیے اعلا تھے کہ انھیں دودھ کے پیکٹ کے لیے لائن میں لگنے کی مصیبت جھیلنی نہیں پڑتی تھی۔ راشن کی دکان پر دھکے نہیں کھانے پڑتے تھے۔ تمھارے سلطان قلی قطب شاہ کو اگر ایک بار آج کی بسوں میں سفر کرنے کا موقع ملتا تو پہلے ہی دھکے میں ان کا سارا نصب العین نیچے آجاتا۔ بس کے ڈنڈے سے لٹک کر سفر کرنے والے آدمی کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ وہ دن لد گئے جب معزز آدمی کے آنے سے پہلے اعلان کیا جاتا تھا''باادب باملاحظہ ہوشیار'' (ص ۲۷)

☆''پچھلے لوگوں کے ایک رومال میں جتنا کپڑا ہوتا تھا اس میں آج سارے خاندان کے کپڑے بن جاتے ہیں بلکہ کچھ کپڑا تو بچ بھی جاتا ہوگا'' (ص ۲۸)

☆''اب حیدرآبادی تہذیب صرف پکوان میں اٹک کر رہ گئی ہے۔ جس تہذیب کا رشتہ پیٹ سے زیادہ اور دل و دماغ سے کم ہو جائے تو اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ پہلے حیدرآبادی تہذیب آدمی کے کردار سے جھلکتی تھی اب اس کی ڈکار سے جھلکتی ہے'' (ص ۲۹)

☆''یہ ضرور تیسرے مینار کی شرارت ہے۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا'' یہ کہہ کر چوتھا مینار خالص حیدرآبادی گالیاں دیتا ہوا تیسرے مینار پر جھپٹ پڑا اور اپنے کلس کو تیسرے مینار کے پیٹ میں بھونکنے کی کوشش کرنے لگا۔

چاروں میناروں میں اچانک حرکت اور ہل چل سی پیدا ہوگئی۔ بالآخر پہلے مینار نے بیچ بچاو کر کے ان میناروں کو لڑنے سے روکا۔ پھر اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور کہا'' دوستو! اب ہمیں سچ مچ یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ اس شہر کے موجودہ رہنے والوں کے کردار کا اثر اب ہم پر بھی پڑنے لگا ہے اور ہم بھی آپس میں لڑنے لگے ہیں''(ص۳۰)

مذکورہ اقتباسات میں حیدرآبادی تہذیب کے تضادات اور ناہمواری کو موازنے کے حربے سے سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے۔ یہاں مہذب متین اور رمز آمیز ظرافتی اسلوب نے فنکار کے فنی خلوص کو بہت واضح کیا ہے۔''نصب العین'' کے اعلا و ادنا، لباس کے عدم توازن، کردار اور ڈکار میں تہذیبی شناخت اور میناروں کی آپسی لڑائی میں انسان کی وحشیانہ فطرت کا اظہار جس گہرے رمز کے ساتھ مجتبیٰ حسین نے ان اقتباسات میں کیا ہے اس کے لطیف طنز کو قاری اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی تخلیقی پرواز کا ایک عمدہ نمونہ'' سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سفر نامہ'' کے عنوان سے لکھا گیا مضمون ہے جس میں انھوں نے محمد قلی قطب شاہ کے کردار کو یوں زندہ کر دیا کہ گویا وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ چار سو برس پہلے کے مرحوم کردار کو چلتا پھرتا کردار بنا دینا یہ احساس دلاتا ہے کہ فنکار کن کن زاویوں سے اپنے موضوع کے متعلق سوچتا ہے اور پھر سوچ کے کسی شاداب لمحے میں اس کے افکار قرطاس کی زینت بننے لگتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کا سفر نامہ پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کی ظرافتی سوچ وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں پر عصری ظرافت نگاروں کی ختم ہوتی ہے۔ یہ پورا سفر نامہ تخیلی ہے مگر مجتبیٰ حسین حقیقت کی سنگلاخ زمین پر اس طرح موجود ہوتے ہیں کہ قاری کے ہونٹوں پر ہنسی ہوتے ہوئے بھی اس کی سوچ لہولہان ہو جاتی ہے۔ ایسی کچھ مثالیں ملاحظہ کریں:

☆''میں نے اس سواری میں بیٹھ کر اپنے بسائے ہوئے شہر حیدرآباد کو دیکھنے کی کوشش کی ۔نتیجہ میں اس شہر کو بالکل نہیں دیکھ پایا۔ کیونکہ میں کسی منظر کو دیکھنا شروع ہی کرتا تھا کہ آٹو رکشا مجھے اچانک اچھال کر میرے منہ کو دوسرے منظر کی طرف کر دیتا تھا''ص۳۳)

☆''میں بعد میں نامپلی اسٹیشن بھی گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک بڑی اژدھے کی شکل کی لمبی سی سواری ہے جس میں ہزاروں آدمی ایک دوسرے پر بیٹھ کر آتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ سواری میں بیٹھ کر آے ہیں۔ میں اسٹیشن پر سینکڑوں مسافروں کی آمد کا منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک مسافر نے اچانک پکارنا شروع کیا''قلی، قلی، قلی''میں نے سمجھا کہ یہ نانجبار مجھے پکار رہا ہے۔ جیسے ہی میں اس کے پاس گیا، اس نے بھاری صندوق میرے سر پر رکھ دیا۔ پھر اس کے اوپر ایک اٹیچی کیس رکھنے کے بعد میرے ایک ہاتھ میں ہولڈال اور دوسرے ہاتھ میں ایک باسکٹ تھما دی۔ پھر بولا''دس روپے دونگا''(ص۳۶)

ان اقتباسات میں مجتبیٰ حسین نے قاری کے آئینۂ خیال میں حال کو اتارتے ہوئے شگفتگی کی فضا قائم کی ہے۔ انھوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے یہاں اپنی فکری تہہ داری سے خوب کام لیا ہے''منہ کا ایک منظر سے دوسرے منظر کی طرف ہونا''

ہزاروں آدمی کا ایک دوسرے پر بیٹھ کر آنا اور سواری کی خوش فہمی میں مبتلا ہونا اسی طرح لفظ ''قلی'' سے غلط فہمی کی فضا پیدا کرنا محض ظرافتی جملے نہیں بلکہ صورتِ حال کے ظریفانہ محاکے ہیں۔ غور کیجیے تو یہ احساس ہوگا کہ مجتبیٰ حسین کے یہاں واقعے سے پیدا ہونے والا مزاح اپنے کردار سے ہم آہنگ ہوکر سامنے آتا ہے۔ دوسرے اقتباس میں یہ ہم آہنگی پورے طور پر موجود ہے۔ اردو میں پطرس ایک ایسے مزاح نگار ہیں جو واقعے سے مزاح پیدا کرنے میں اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں واقعہ، کردار کے گرد گھومتے ہوئے اچانک مضحکہ خیز فضا کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ایک غیر متوقع نتیجہ قاری کے لیے باعثِ مسرت بن جاتا ہے۔ یہ خوبی مجتبیٰ حسین کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا مجتبیٰ حسین کو ''پطرس بخاری کی کرسی کی طرف بڑھتا ہوا دیکھنا'' (شگوفہ حیدرآباد، مجتبیٰ حسین نمبر ص ۴۲) کچھ انھیں خوبیوں کی بنیاد پر ہے۔ آخری اقتباس میں قلی قطب شاہ کا ''مروجہ قلی'' بن جانے کے پس پردہ واقعہ کا کردار کے گرد گھومتے ہوئے مضحکہ خیز فضا میں تبدیل ہونے کا قاری کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ مگر مجتبیٰ حسین نے یہاں کیا خوب فنی مظاہرہ کیا ہے۔

اس سفرنامے میں لفظ ''قلی'' سے قاری محمد قلی قطب شاہ کو پڑھتے ہوئے بھی ہر آن مروجہ ''قلی'' تک کا ذہنی سفر کرتا رہتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اس ڈرامائی سین کو ترتیب دیتے ہوئے نہ صرف مزاح کے پہلو کو ابھارا ہے بلکہ قاری کے ذہنی رجحان تک پہنچ کر ایک ذہنی رشتہ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس پہلو سے غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین لفظوں کے استعمال میں ممکنہ راہیں بڑی گہرائی سے تلاش کرتے ہیں۔

''آخر کار'' میں پانچ مضامین مشاعرے کو محور بنا کر لکھے گئے ہیں۔ ''مشاعروں کے شاعر'' ''اردو مشاعرے اور بیرونی سیاح'' ''مشاعرے اور مجرے کا فرق'' ''معذرت نامہ'' اور ''مشجرہ'' جیسے عنوانات کے تحت مجتبیٰ حسین نے ایک موضوع کو مختلف روپ میں بڑی کامیابی اور فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس کے ماحول کا جائزہ کسی تیسری آنکھ سے لیتے ہیں اسی لیے ان کے یہاں فکری پختگی ہمیں بار بار متوجہ کرتی ہے۔ ان پانچوں مضامین میں مشاعرے کی جن جزئیات پر توجہ دی گئی ہے ان میں فنکار کی عصری حسیت کا عکس بہت واضح ہے۔ ماحول، فضا، کردار، مشاہدے اور طنز و مزاح کے حربے مشاعرے کی دنیا سے پورے طور پر ہم آہنگ ہیں۔ اسی لیے ان میں دلچسپی کے عناصر سمٹ آئے ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے قاری حیران کن لمحوں سے گزرتا ہے۔ ہونٹوں پر ہنسی تو آتی ہے مگر لطیف طنز کے نشتر سے وہ گھائل بھی ہوتا ہے۔ مذکورہ مضامین کے پس منظر میں مجتبیٰ حسین نے دراصل اپنے زخمِ دل کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ آج غیر ادبی مزاج رکھنے والے شاعر اور متشاعروں کے ساتھ متشاعرات کی بھیڑ میں مشاعروں کی ادبی روایت جس طرح مجروح ہو رہی ہے وہ ہمارے ادب کا المیہ ہے۔ اس المیے پر مجتبیٰ حسین نے جیسے قہقہے لگائے ہیں ان میں ان کے آنسو صاف نظر آتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ظرافت نگار کے قہقہے پر زیادہ اور آنسوؤں پر توجہ کم دیتے ہیں۔

''مشاعروں کے شاعر'' میں گھائل مرادآبادی کے کردار کے گرد مشاعروں کے شاعر کی جو کیفیت ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے اس کی صداقت ہمیں رنجیدہ کرتی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے گھائل مرادآبادی میں وہ تمام خوبیاں اکٹھی کر دی ہیں جو کسی ''متشاعر'' کو نامور بناتی ہیں۔ آدابِ مشاعرہ، داد، ہوٹنگ، معاوضے، شعری اثاثے، پے در پے مشاعرے میں شرکت، ایک ہی کلام کو ہر مشاعرہ میں پڑھنے کی مجبوری، پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ اشعار کسی کی نذر کرنے کی خوبی اور کمپیوٹر کے ذریعے بارعب

بننے کی فطرت جیسے پہلوؤں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مشاعرے کا شاعر بیک وقت کتنے حربوں کو استعمال کرتا ہے۔ کچھ اقتباسات دیکھیں:

☆''شاعر اگر ادب میں زندہ رہنا چاہے تو اس کے لیے بیاض ضروری ہے لیکن اگر سوال صرف مشاعروں میں زندہ رہنے کا ہو تو وہاں بیاض کا کیا کام'' (ص۹۲)

☆''ان کا کلام بھلے ہی عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو لیکن وہ اپنے معمولات کو قابو میں رکھنے کے لیے نہایت عصری آلات کا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک چھوٹا سا کمپیوٹر نما آلہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں'' (ص۹۳تا۹۴)

غالب سے تقابلی مکالمے کے کچھ خصوصی حصے بھی سن لیجیے:

☆''اگر آج غالب بھی میرے ساتھ کسی مشاعرے میں اپنا کلام سناتے تو انھیں وہ داد نہ ملتی جو مجھے مل سکتی ہے۔ اس لیے کہ غالبؔ موسیقی کے اسرار و رموز سے بالکل واقف نہ تھے۔ سنا ہے وہ بھی کبھی کبھی ترنم سے کلام سناتے تھے اور میں سامعین کو اپنے کلام سے صرف ترنم سناتا ہوں'' (۹۵)

☆''بلاشبہ غالبؔ نے حکمرانوں اور صاحبانِ ثروت کی شان میں بیسیوں قصیدے کہے، لیکن مرے تو مقروض ہی مرے۔ میرا کل سرمایہ صرف بیس غزلوں پر مشتمل ہے۔ مشاعرہ پڑھتے وقت میں ان میں سے کسی غزل کا کوئی شعر بڑی ہوشیاری کے ساتھ کسی ڈپٹی کمشنر یا کسی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا کسی وزیر کی نذر کر دیتا ہوں، بلاشبہ ان بیس غزلوں کے ایک ایک شعر کو سیکڑوں مرتبہ مختلف افراد کی نذر کر چکا ہوں اور سب اپنی اپنی جگہ خوش ہو چکے ہیں'' (ص۹۵)

''کلام سے ترنم سنانا'' اور ایک ہی شعر سیکڑوں مرتبہ مختلف افراد کی نذر ہونے کے باوجود بھی سب کا اپنی جگہ خوش ہونا مشاعرے کی اندھیر نگری پر بھرپور وار ہے۔

''اردو مشاعرے اور بیرونی سیاح'' میں بھی فنکار کی دانشورانہ بصیرت سامنے آتی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اس مضمون میں دو بیرونی سیاحوں کے کردار کو پیش کیا ہے جس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ دونوں اردو سے نابلد ہیں مگر اردو مشاعرہ سننے کے شوق میں گرفتار ہیں۔ دونوں کرداروں کے تعارف میں مجتبیٰ حسین کا صرف اتنا لکھنا کہ ''(جو اردو بالکل نہیں جانتے)'' اور عنوان میں ''بیرونی'' کا لفظ اردو مشاعرے کے سامعین کی جن کیفیت کو سامنے لا رہا ہے اس میں طنزِ لطیف کے دو پہلو آ گئے ہیں۔ ایک کا تعلق سامعین کی جہالت اور اردو سے ناواقفیت سے ہے اور دوسرے پہلو کا نشانہ سیدھے مشاعرے کے شاعروں پر ہے کہ وہ کن لوگوں کے بیچ اپنا کلام سنا رہا ہے اور ان کی داد پر خوش بھی ہو رہا ہے۔ گویا دونوں کی حالت شعری ناواقفیت اور خوش فہمی میں ایک جیسی ہے۔ ایک خوش ہے کہ وہ مشاعرہ پڑھ رہا ہے اور ایک خوش ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے شاعر کو شعر پڑھنے سے پہلے ہی داد دے رہا ہے ۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

☆''پھر انھوں نے پوچھا کہ ''اور یہ کلام پر سامعین کی طرف سے داد دی جاتی ہے تو کیا اس کی مقدار بھی پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے کہ کس کے کلام پر کتنی داد دی جائے گی؟'' ہم نے کہا ''داد دینے کا معاملہ بھی مشکوک ہے۔

اکثر شعرا اپنے سامعین اپنے ساتھ لے آتے ہیں اور جن کے داد دینے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ابھی شاعر صرف ''عرض کیا ہے'' ہی کہتا ہے اور ادھر اس کے سامعین ''مکرر ارشاد'' کا نعرہ بلند کر دیتے ہیں۔ بے ساختہ داد وہی ہوتی ہے جو بنا سوچے سمجھے دی جائے'' (ص۹۹)

اس سلسلے کے بقیہ مضامین بھی کافی دلچسپ ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''مشاعرے اور مجرے کا فرق'' شاعرات کو محور بنا کر لکھا گیا ہے۔ اسی لیے یہاں طنز کے پہلو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چند اقتباسات دیکھیں:

☆''جبکہ ہماری بعض شاعرات کی شاعری میں، شاعری کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ ''ماورائے شاعری'' کی ہوتی ہے'' (ص۱۰۳)

☆''اگر اس کی شاعری کانوں سے سنی جائے تو ہوسکتا ہے کہ بعض مصرعے بحر سے خارج نظر آئیں، وزن بھی کہیں کہیں گر رہا ہو۔ لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھیں تو واللہ وہ سراپا پابند بحر نظر آتی ہے۔ وزن میں ایسی جکڑی ہوئی اور تنی ہوئی کہ دیکھنے والے کا وزن گر گر جائے اور سنبھالے نہ سنبھلے'' (ایضاً)

''معذرت نامہ'' کا یہ اقتباس بھی دیکھیے جس میں ہم وزن لفظ سے نشتریت کی کیسی راہ ہموار کی گئی ہے:

☆''انھوں نے یہ بھی کہا کہ صرف شاعرات پر اعتراض کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ آپ ان مرد شاعروں پر کیوں اعتراض نہیں کرتے جو طرح طرح کے حلیے بنا کر مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور مشاعروں کو مجرا تو کجا ''حجرہ'' تک بنانے پر تلے ہوتے ہیں'' (ص۱۱۰)

''آخر کار'' کے دو مضامین ''اعتراف کرنے والوں کی خدمات کا اعتراف'' اور ''جشن سے کس کو رستگاری ہے'' کچھ الگ نوعیت کے ہیں۔ یہ دونوں مضامین ایسی محفلوں میں پڑھے گئے جن کا انعقاد مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کو ملحوظ رکھ کر ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں مجتبیٰ حسین نے اپنی ذات کو ہدف بنا کر متعلقہ موضوع کی وسیع تر ناہمواریوں کو سمیٹنے میں کامیابی پائی ہے۔ طنز و مزاح میں خود کو ہدف بنانے کے لیے فنکار کا وسیع الظرف ہونا ضروری ہے۔ یہاں عدم توازن سے شخصی وقار کے مجروح ہونے کا خدشہ ہر آن رہتا ہے۔ اسی لیے وقت کا نباض ظرافت نگار خود پر ہنستے ہوئے ایسے پیرایے اختیار کرتا ہے جن میں محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود پر نہیں بلکہ ہماری کسی بڑی کمیوں اور کوتاہیوں پر خندہ زن ہے۔ ان مضامین سے ایسے کچھ نمونے ملاحظہ کریں:

☆''سچ تو یہ ہے کہ آپ میری خدمات کے اعتراف کے لیے یہاں خواہ مخواہ ہی جمع ہو گئے ہیں۔ کیونکہ جب میں خود اپنی خدمات کا اعتراف کر رہا ہوں تو میری خدمات کے اعتراف کے لیے آپ کیوں اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں'' (ص۴۷)

☆''حیدرآباد اور حیدرآبادیوں سے اس لیے محبت کرتا ہوں کہ وہ کسی کی خدمات کا اعتراف کرنے پر تل جاتے ہیں تو اعتراف کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ حیدرآبادی پہلے تو کسی کو بہت

اونچائی تک اچھال دیتے ہیں اور جب وہ نیچے آنے لگتا ہے تو سب کے سب دور ہٹ جاتے ہیں'' (ص ۷۸)

☆''حضرات! میں اجتماعی طور پر آپ سب کا ممنون ہوں کہ آج آپ نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو اردو کے معاشرے میں ایک ادیب کے ساتھ اس کے مرنے کے بعد کیا جاتا ہے'' (ص ۷۸)

☆''حضور! جس طرح غائبانہ نمازِ جنازہ ہوتی ہے کیا اس طرح ہمارا غائبانہ جشن نہیں ہوسکتا''

بولے''جناب آپ جنازہ اور جشن کا فرق بھی نہیں جانتے۔ جنازہ میں لوگ کسی کے گزرنے جانے کے بعد اس کی پیٹھ پیچھے تعریف کرتے ہیں اور جشن میں ''صاحب جشن'' کے منہ پر تعریف کی جاتی ہے۔آپ تو جہاندیدہ آدمی ہیں۔ اردو معاشرہ میں منہ پر تعریف کرنے اور پیٹھ پیچھے غیبت کرنے کو ہمیشہ مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ آپ نہیں آئیں گے تو ہم کس کے منہ پر آپ کی تعریف کریں گے'' لہذا حضرات کیجیے ہماری تعریف اور یہ رہا ہمارا منہ'' (ص ۸۸تا۸۹)

ان چاروں اقتباسات میں مجتبیٰ حسین نے خود پر ہنسنے کے لیے کسی عملی مذاق کا سہارا نہیں لیا بلکہ وسیع القلبی اور مزاح کے صحت مندانہ حربے استعمال کیے جن سے ان کے ذوقِ مزاح کی بلندی کا توانا احساس ہوتا ہے۔ ہر اقتباس کے آخری حصے سے جو مزاحیہ کیفیتیں ابھر رہی ہیں ان میں صورتِ حال کو وسیع تناظر عطا کر کے قاری کے لیے اس فیصلہ کو مشکل بنا دیا گیا ہے کہ وہ انھیں پڑھ کر ہنسے یا روئے!!

ان مضامین میں فنکار کی فکری اور ظرافتی زاویۂ نظر کے کچھ ایسے چھینٹے بھی پڑے ہیں جو باتوں باتوں میں اس طرح سامنے آتے ہیں کہ ان سے مجتبیٰ حسین کے فن کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔اس حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ☆''جو لوگ روزانہ مزاحیہ کالم نگاری کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ روزانہ مزاحیہ کالم نگاری ایک کڑی آزمایش کا نام ہے۔ اچھے اچھوں کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔ بائیس برس پہلے کی وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میری چھے سالہ بیٹی اچانک اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔علی الصبح مٹی کا قرض مٹی کو سونپ کر قبرستان سے واپس ہوا۔ ابھی ہاتھوں سے قبر کی مٹی بھی اچھی طرح نہیں جھاڑی تھی کہ مزاحیہ کالم لکھنے بیٹھ گیا۔ کالم چھپا تو لوگوں نے اس کالم کی بے حد تعریف کی۔سبحان اللہ۔ ماشاءاللہ۔ میں حیرت میں پڑ گیا۔لوگوں کو ان حالات سے واقف کرانے کی کوشش کی جن میں، میں نے یہ کالم لکھا تھا۔ پھر یہ بھی کہا''بیٹی تو روز روز نہیں مرتی لیکن اخبار کے کالم کو ہر روز زندہ رکھنا پڑتا ہے''۔

اس کے جواب میں لوگوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہنا چاہتے ہوں''خدا کرے تیری بیٹی ہر روز اسی طرح مرتی رہے اور ہمیں تیرے دلچسپ کالم پڑھنے کو ملتے رہیں''

اس واقعے کے بعد اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ مزاح نگاری دراصل اپنے اور دوسروں کے دکھ کو کبھی خوبصورتی کے ساتھ

چھپانے ،کبھی اسے اجاگر کرنے ، درد کے چہرے پر خوش گواری کا مکھوٹا چڑھانے اور ناگوار زندگی کو گوارا بنانے کا نام ہے۔ مزاح نگار کا صرف ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ باظرف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔اس کے بعد میری مزاح نگاری کا یہ نصب العین سا بن گیا کہ آنکھوں میں قہقہے اور ہونٹوں پر آنسو سجاتے چلے جاؤ۔ سچا مزاح وہی ہے جو سچے غم کو اپنی ذات میں انگیز کر لینے کے بعد طلوع ہوتا ہے''(۷۷)

اس اقتباس میں مجتبیٰ حسین نے زندگی کے بڑے صدمے سے گزرنے کے بعد لوگوں کے ردِّعمل کو دیکھتے ہوئے اپنی مزاح نگاری کا جو نصب العین طے کیا ظاہر ہے اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ'' آنکھوں میں قہقہے اور ہونٹوں پر آنسو سجاتے چلے جاؤ''۔ یہاں مجتبیٰ حسین کے باظرف ہونے کا عملی نمونہ قاری کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ انھوں نے'' سچا مزاح'' اور'' سچے غم'' کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے بڑی قیمت چکائی ہے۔موت تو اٹل حقیقت ہے جو مجتبیٰ حسین کی بیٹی کے لیے اپنے مقررہ وقت پر آئی مگر انھوں نے یہاں سے مزاح اور غم کے باہمی رشتوں کے نکات کو جس باریک بینی اور تجربے کی روشنی میں حاصل کیا وہ ان کے فن میں عمدگی کے ساتھ سماتے چلے گئے ہیں۔

'' آخرکار'' کے دو مضامین ''لو برسات آ گئی'' اور'' خوش فہمیاں'' ظرافت کے بجائے انشائیہ معلوم ہوتے ہیں۔ انشائیے کی خوبی،لطف انگیزی،فکری ترنگ اور اسلوب کی دلآویزی ظرافت سے بہت کچھ مختلف ہوتی ہے۔انشائیہ اپنے موضوع کو پہلو بہ پہلو اجاگر کرتا اور اس کے نئے نئے گوشے اس طرح سامنے لاتا ہے کہ قاری تحیر آمیز کیفیتوں کے ساتھ یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ہم ان نادیدہ پہلوؤں سے کس قدر غافل تھے اور کبھی اس طرف تصور بھی نہیں گیا۔ یہیں سے لطف اندوزی کی ایک الگ دنیا انشائیے پر محیط ہو جاتی ہے۔

ان دونوں انشائیوں میں قاری کچھ ایسی ہی کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ برسات کی الگ الگ خصوصیات بلکہ پہلو یہاں اجاگر ہوتے ہیں۔مجتبیٰ حسین کے مطابق کبھی یہ امیدوں کا موسم ہوتا ہے،کبھی آدمی اس میں تمام تر کوشش کے باوجود بھیگنے سے نہیں بچ پاتا، رین کوٹوں،ٹوپیوں اور چھتریوں کی وجہ سے کبھی ایک دوسرے کو پہچان نہیں پاتا۔کبھی اس موسم میں نئے نئے تعلقات اور نئے نئے دوست پیدا ہوتے ہیں۔اس موسم میں جابجا چھتریاں ہی چھتریاں نظر آنے لگتی ہیں اور اس میں کیچڑ کی بالکل قلت نہیں ہوتی۔ یہ تمام پہلو یکے بعد دیگرے لطف انگیز طرزِ ادا میں سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔اسی طرح ''خوش فہمیاں'' میں انسان کی ''خوش فہمی'' کو زاویے بدل بدل کر دکھانے کی سعی ملتی ہے۔ یہ مضمون بھرپور انشائیہ معلوم ہوتا ہے جبکہ ''لو برسات آ گئی'' میں نیم مزاحیہ اور نیم انشائیہ کی کیفیت ملتی ہے۔بطورِ دلیل ''خوش فہمیاں'' سے کچھ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆''ہم اپنی پچاس سالہ زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اپنی زندگی خوش فہمی اور غلط فہمی کے بیچ لٹکے ہوئے پنڈولم کی مانند دکھائی دیتی ہے''(۱۱۶)

☆''خوش فہمی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے جس کے بل بوتے پر ہم اپنے بل بوتے کو دھوکا دیتے ہیں۔خوش فہمی نہ ہوتی تو ہم وہ نہ ہوتے جو آج دکھائی دیتے ہیں''(۱۱۶)

☆''نوجوانی کے زمانے میں ہمیں یہ خوش فہمی تھی کہ ہم بڑے خوبرو نوجوان ہیں حالانکہ ان دنوں آئینہ بڑی پابندی سے دیکھا کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ آئینہ میں ہم وہ نہیں دیکھتے تھے جو آئینہ ہمیں دکھاتا تھا بلکہ وہ دیکھتے

تھے جو ہماری خوش فہمی ہمیں دکھلانا چاہتی تھی''(۱۱۷)

☆''سچ پوچھیے تو ہر طرف خوش فہمیوں کا ہی دور دورہ ہے۔ تاجر اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ گاہک کو بے وقوف بنا رہا ہے اور گاہک اس خوش فہمی کا شکار ہے کہ اس نے بھاؤ تاؤ کر کے تاجر کو بے وقوف بنایا ہے۔ افسر کی خوش فہمی یہ رہتی ہے کہ اس کے ماتحتین اس سے بہت خوش ہیں اور ماتحتین اس خوش فہمی میں زندگی گزار رہے ہیں کہ وہ اپنے افسر کو بڑی خوش اسلوبی سے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ افراد کی خوش فہمیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ کچھ ممالک بھی خوش فہمیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنے آپ کو کائنات کا مرکز سمجھتے ہیں''(۱۱۹)

غور کیجیے! مذکورہ اقتباسات میں ''خوش فہمی'' کے کتنے زاویے منور ہوئے ہیں۔ ان میں فرحت بخش اور انبساط انگیز کیفیت کا تعلق ظرافت کے بجائے جدید انشائیے کی تکنیک سے ہے۔

مجتبیٰ حسین کے موضوعات مشاہدے، تجربات اور عصری حسیت سے مملو ہوتے ہیں۔ وہ انسانی نفسیات کے ساتھ ساتھ خارجی واردات کو اپنی ظرافت کا حصہ بناتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی کجیوں اور کوتاہیوں میں مضحک پہلو ڈھونڈنا انھیں خوب آتا ہے۔ موضوعاتی تنوع کو ان کے مضامین میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سیاست، سیاسی لیڈر، علم وادب، انسان کے قول وعمل کے تضادات، مالی مفاد، موقع پرستی، وعدے، مذہبی گوشے، عبادات، تہذیب و تمدن، تاریخ، امیری و غریبی اور اسراف ایسے کئی موضوعات ہیں جو اس کتاب میں سامنے آتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے فن کے متعلق یہ رائے بہت توانا ہے کہ وہ واقعات اور کردار سے طنز و مزاح کا کام لیتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس رائے کی تصدیق ہو جاتی ہے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان واقعات اور کردار کی تشکیل کسی عامیانہ قصے اور کردار کی طرح نہیں ہوتی بلکہ ان میں تخلیقیت کی کرشمہ سازی بار بار دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔ موضوع اور صورتِ حال کی ستم ظریفی سے ان واقعات اور کردار کا ایسا رشتہ ہوتا ہے کہ ان میں گہرائی کے سلسلے دور تک قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ مجتبیٰ حسین نہ صرف موضوعاتی وسعت کو اپنے فن کا حصہ بناتے ہیں بلکہ ہر موضوع کی مناسبت سے واقعات، کردار اور مکالمے تخلیق کرتے ہیں جن میں تحیر آمیزی کے پہلو قاری کو متاثر کرتے ہیں اور اس کا ذہن ایک ہی لمحے میں دو طرف پرواز کرتا ہے۔ ایک عبارت سے منور ہونے والے طنز و مزاح کی طرف اور دوسرا فن کار کی تخلیقی سوچ اور طرزِ ادا کی طرف۔ پوری کتاب کے موضوعات اور ان کے اظہار پر نظر ڈالیں تو مجتبیٰ حسین کے فن کی جدت پورے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ یہاں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اُس صنف سے جس کو دوسرے درجے کا ادب سمجھا گیا، وہ کام لیا، جو پہلے درجے کے ادیبوں میں کم نظر آتا ہے۔ یہ فن کار کی فطری حسِ ظرافت کے ساتھ ساتھ فنی خلوص اور تخلیقی مکاشفے کا قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

مجتبیٰ حسین نے جس اسلوب کو اپنایا اس میں شایستگی، سنجیدگی، ضبط اور فکری بصیرت کی شعائیں ملتی ہیں۔ وہ اپنے ردِّ عمل کو تخلیقی اپج کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے جملے اور پیرایے اعلا سوچ اور گہری فکر میں تپ کر تشکیل پاتے ہیں۔ اس اسلوب میں ان کی ظرافت نگاری اس طرح ڈھلی ہے کہ متن کے بطون سے پھوٹنے والی روشنی ہمارے وجود پر پھیلتی چلی جاتی ہے جہاں ہم سوچتے اور ہنس کر رونے لگتے ہیں۔ یہی طریقۂ کار مجتبیٰ حسین کے فن کو تابناک بناتا ہے۔

☆☆☆

حلیمہ فردوس

مضمون

# نسائی شاعری کا لہولہو منظر نامہ

اکیسویں صدی نسائی شاعری کے لیے خوش آئند ثابت ہورہی ہے۔ وہ ان معنوں میں کہ شاعرات کی درج شدہ دستخط پر نظریں مرکوز ہونے لگی ہیں اور بے اعتنائی کی دھُند چھٹنے لگی ہے۔ مگر فارمولہ ٹائپ تانیثیت پسند صرف اس کے احتجاجی رویے ہی کو اس کا محور سمجھتے رہے ہیں۔عموماً نسائی شعری سرمایے پر بغیر ردوقدح کے تانیثیت کی مہر ثبت کی جاتی ہے۔آج بھی نسائی شاعری درست تفہیم کی منتظر ہے کیونکہ نامور شاعرات کے مندرجہ ذیل اقتباسات قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کی اہم نسائی آواز یعنی ادا جعفری کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

''آج مشرقی عورت اپنی ذات کے سواء بھی پورے معاشرے کے زخموں اور جراحتوں کی گواہ ہے اور ہر ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔غم دوراں سے اغماض ممکن ہی کہاں ہے۔خواتین کی شاعری محض نسائیت کے حوالے تک محدود نہیں رہ سکتی۔'' (جو رہی دو بے خبری ہے۔صفحہ 366)

بانوئے فرعون کو ارتفاعِ بیت کی علامت قرار دینے والی شاعر شفیق فاطمہ شعری بھی یہ کہنے پر مجبور ہے۔

''یہ ضروری نہیں کہ ان خیالات کی بنا پر میں اناثی تحریک کی گردِکارواں سمجھی جاؤں۔بات تو یہ ہے کہ اس تحریک کے رطب و یابس کا بوجھ اٹھانا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔'' (سلسلۂ کائنات،صفحہ 181)

تانیثیت کے حوالے سے زیدی بہنوں کا رویہ کچھ ان شاعرات سے مختلف نہیں ہے۔

''براہِ کرم نقاد حضرات یا دوسرے ادیب و شاعر میری شاعری کو تانیثی چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش نہ کریں۔اوّل تو تانیثیت پر جس قسم کو گفتگو ہورہی ہے،اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسے نہایت محدود اور کسی قدر گمراہ کن معنوں میں سمجھا گیا ہے۔'' (شامِ تنہائی۔ دیباچہ۔زاہدہ زیدی)

ساجدہ زیدی نقادوں پر کچھ اس طرح نشانہ سادھتی ہیں۔

''میں عورت ہوں لیکن میری شاعری مرد اساس سماج میں رائج عورت سے متعلق تمام کلیوں کی نفی ہے، تردید ہے.....عورت کو شاعری کے حوالے سے ایک مکمل، باشعور، ہمہ جہت تخلیقی وجود کی طرح نہ مردوں (اور نقادوں) نے کبھی دیکھا نہ اس کی کوشش کی ہے۔(پردہ ہے ساز کا۔دیباچہ۔ساجدہ زیدی)

مذکورہ بالا بیانات، تانیثی رویے سے قطع نظر نسائی شاعری کے دیگر پہلوؤں پر غور کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ نسائی شاعری نے اپنے زمانے کے اضطراب کو کس حد تک جذب کیا ہے۔ ذات اور کائنات کا سفر کیسے طے کیا ہے۔ معاشرے کی پامالی پر شاعرات کی آنکھیں کس قدر نم ہوئی ہیں۔اور انسان کے دہانِ زخم سے رِستے لہو کو بیان کرنے میں انہیں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

نسائی شاعری میں عصریت تلاش کرنے سے پہلے ہمارے معاشرے کے پس منظر کا جائزہ بھی ضروری ہے۔اِدھر چار دہائیوں میں عالمی منظر نامہ ہی کیا ہمارا معاشرہ بھی بدل چکا ہے۔ایک جانب حیرت انگیز سائنسی ایجادات نے انسانوں کو خواہشوں کا غلام بناڈالا تو دوسری جانب عالم کاری کے تصور سے دنیا

ایک منڈی میں تبدیل ہوگئی۔ عالمی سطح پر اقتدار کی جنگ کے نتیجے میں بے شمار مسائل کھڑے ہوگئے۔ چند ممالک میں جبر و استبداد عدم مساوات، استحصال اور نسل کشی کا سبق دہرایا جانے لگا۔ مہلک ترین آلاتِ حرب کے سوداگروں نے قدرتی خزانوں سے معمور بستیوں کو قتل گاہوں میں تبدیل کر دیا۔ ایسے میں تشدد و فکشن ہی کیا شاعری کا بھی حصہ بن گیا۔

اس میں دو رائے نہیں کہ شاعرات نے عصری موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ عالمی وقوعات اور اپنے ملک کے کشیدہ حالات نے انہیں بے طرح متاثر کیا۔ ان المناک واقعات کو کلام میں نشان زد کر کے خواتین نے اپنے مکمل وجود کی نہ صرف تصدیق کی بلکہ باشعور ہونے کا ثبوت دیا۔ شفیق فاطمہ شعریٰ، زہرا نگاہ، کشور ناہید، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی کے علاوہ نئی نسل کی شاعرات کا کلام ان کی سیاسی، سماجی بصیرت اور ان کی فنی صلاحیتوں کا غماز ہے۔ شعریٰ نے اسلامی تاریخ کے حوالے سے عصر حاضر کی جبری طاقتوں کو آئینہ کیا۔ بوسینیا، زندان نامہ کے علاہ سلسلۂ مکالمات کی نظموں میں شاعرہ نے صیہونی طاقت کے خلاف اپنی تشویش اور احتجاج کو درج کیا۔ اس احتجاج میں غصہ نہیں، فکرمندی شامل ہے۔ ایک درد سمایا ہوا ہے۔ ان کی نگاہ میں بغداد کی پامالی وہ پامالی ہے جس سے آنکھوں میں آنسوؤں کا قحط پڑ جاتا ہے۔ ساجدہ زیدی کی نظموں ''مغرب کے خداؤں نے'' ''اے خدا تیرا جہانِ معبود' اور ''یہ صحرائے عرب ہے'' (ہر دو حصے) میں نسلِ انسانی کے پُرسوز حالات کو زبان عطا کی گئی ہے۔ زہرا نگاہ کی نظم ''نظر بھر کے تم ان پہاڑوں کو دیکھو'' کشور ناہید کی ''جلتے دمشق و بصریٰ کی بجھتی آوازیں''، بلقیس ظفیر الحسن کی ''عراق'' شہناز نبی کی ''بغداد'' اور ملکہ نسیم کی ''صومالیہ'' میں انسانیت سوز واقعات اور دہشت گردی کے نتیجے میں درپیش مصائب کو فلسفیانہ فکر اور نسائی جذبات کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے جبکہ شائستہ یوسف نے نظم ''بائیسویں صدی میں'' کائنات کی سرعت سے بدلتی خوفناک صورتحال کو نسوانی فطری تمنا کے ذریعے علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔

مچھروں پر بھی نظر رکھنا ہے/ ورنہ یہ فسادی مغزۂ نمرود میں/ حرکتوں سے اپنی بھڑکاتے رہیں گے/ بے سبب تشویش کا آتش کدہ

(شفیق فاطمہ شعریٰ)

عجب عیار، دہشت گرد، قوت کی خدائی ہے/ کہ مجبوروں پہ دنیا تنگ ہے/ دریائے خون میں ڈوبی ہیں/ ان کی تقدیریں! / لہو انسان کا لرزاں ہے/ بازارِ سیاست میں/ فقط بارود کی قوت کا سِکّہ چل رہا ہے/ (ساجدہ زیدی) یہاں مرنے والوں کی تعداد ہے، اذنِ نوحہ گری ہے/ پُرسشِ غم ہے، امید چارہ گری ہے/ وہاں ہُو کا عالم ہے بس خاموشی ہے/ وہاں خاموشی صرف گولی کی آواز سے ٹوٹتی ہے/ نظر بھر کے تم اُن پہاڑوں کو دیکھو/ (زہرا نگاہ) اُٹھو امّاں/ لاشوں کے ڈھیروں سے اٹھو/ اپنی گود کے پالوں کو دفنانے اُٹھو/ خون میں ڈوبا سارا بصرہ کیا لگتا ہے/.....صحرا کیا، سمندر کیسا/ ہر چپے پہ اس کے پیلے دانت گڑے ہیں/ سامراج کی آنکھیں نہیں ہیں/ آگ کے دو گولے ہیں جن میں/ ہوس کا ایندھن بھرا ہوا ہے۔ (کشور ناہید) لہلہاتے کھیتوں پہ قحط کی بارش ہونے لگی ہے/ عجائب گھروں سے تہذیب کی علامتیں غائب/ شہروں سے ہماہمی رخصت/ قبرستان کا سناٹا بڑھتا ہی جا رہا ہے/ معصوم مسکراہٹوں پہ پھپھوندی جم گئی ہے (شہناز نبی) میں تنہا ویرانیوں میں/ سوکھے دریا کے کنارے/ اس پہاڑ کی کھوج میں کوشاں/ جس نے دریائے نیل سے/ سارا پانی اپنی کوکھ میں سمیٹا/ میں منتظر ہوں ایک بڑے جشن کی/ میرے بچے کے جنم کی/ اس نئے بچے کی/ جس کے رونے کی آواز قہقہوں پر حاوی ہو جائے/ گریہ وزاری اس پہاڑ میں مقید/ دریائے نیل کو از سرِ نو بہا دے۔ (شائستہ یوسف)

ان مذکورہ بالا حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نسائی شعری کینواس پر تباہی کے بے شمار مناظر بکھرے ہوئے ہیں۔ سُپر پاور قوم کے سفاکانہ طرز عمل کے مشاہدے سے شاعرات کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔اس کے باوجود انہوں نے اپنے روحانی کرب اور سینے میں جذبات کے ابلتے لاوے کو الفاظ کی صورت میں صفحۂ قرطاس کے حوالے کیا ہے۔ان نظموں کا نمایاں وصف رنج ومحن میں ڈوبا نشتریت سے معمور لہجہ ہے،جس میں کہیں کہیں انتباہ کا انداز بھی شامل ہے۔آج تشدد اور دہشت گردی جیسے الفاظ زندگی کی لغت میں شامل ہو گئے ہیں۔ عالمی سطح کے وقوعات کے علاوہ آئے دن ہمارے ملک میں فسادات کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ سیاسی بازیگروں نے اپنے مفاد کی خاطر معصوم اور مجبور نوجوانوں کے گلے میں دہشت گرد کی تختیاں لٹکا دیں۔گجرات،ملیانہ، بھاگلپور،اور کشمیر کی کرفیوزدہ سڑکیں لاشوں سے پٹنے لگیں اور کئی شہر ماتم کدہ بن گئے۔ مذہبی مقامات کی پامالی اشتعال انگیزی کی صورت اختیار کر گئی۔شر پسندوں کی منصوبہ بند سازش کے تحت بوسیدہ گنبد کا انہدام ادب میں تقسیم ہند کے بعد ایک اہم واقعہ قرار پایا۔شاعرات ان خونچکاں واقعات کی نہ صرف گواہ بنیں بلکہ اس کرب کو اپنی روح میں بسا لیا۔ساجدہ زیدی کی نظم ''میرے نونہالوں کی.....'' میں ایک ماں کا کرب چیخ کی صورت میں ڈھل گیا۔ جو اپنے نونہالوں کی لاش پر بین نہیں کرتی بلکہ ظالم حکمرانوں سے اپنے پُرکھوں کی قربانیوں کا حساب مانگتی ہے،تو عذرا نقوی طنزیہ لہجے میں شر پسندوں سے رام کی دھرتی کی بدلتی فضا پر سوال کھڑے کرتی ہیں اور فسادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشی اور سماجی مسائل کی جانب ہند کے باسیوں کی توجہ مبذول کراتی ہیں۔

کہاں گئے میرے لعل و گوہر؟/ یہاں میں اکیلی پاپن! جس نے راتوں کا چین دن کا سکون/اور آنے والی صبحوں کا سارا سونا گنوا دیا ہے..... یہ بے بسی، بے گناہوں کی سزا ہے یارب/کہ ہم نے اپنے وطن میں سب کچھ لٹا دیا ہے/ یہ کیسی سفاک قوتیں ہیں/ یہ کن درندوں کی سازشیں ہیں/جنہوں نے معصوم پیر طفل و جوان کی/لاشوں پہ اپنے مسند سجا لیے ہیں/ پوتر اگنی کا لَو بڑھانے کو/ زندہ جسموں کے آتشیں کُنڈ/ یقین کا سورج جلا لیتے ہیں/ یہ آگ انسانیت کے قدموں کو پھونک دے گی/یقین کا سورج کبھی نہ چمکے گا اس نگر میں/ (میرے نونہالوں کی.....ساجدہ زیدی)

ہر کیسری جھنڈے سے یہ پوچھنا چاہوں گی/اک مسجدِ ویراں نے کیا ان کا بگاڑا تھا/ یہ پوچھنا چاہوں گی/تم رام کی دھرتی کو اب سونے کی اینٹوں سے لنکا تو بناتے ہو/تم کو نہ نظر آئے/اس رام کی دھرتی پر ناسور/ جو پلتے ہیں/غربت میں پلے بچے جرموں میں پنپتے ہیں/کیا رام کی دھرتی پر بھارت کے رتن ہیں یہ (ملبے کی کہانی۔۔۔عذرا نقوی)

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ملک کے برگشتہ حالات کے باوجود شاعرات کا یقین مستحکم ہے۔ گو فسادات اور تضادات کی وجہ سے ہر فرد خدشات میں گھر گیا ہے لیکن نسائی شعری آوازوں میں خود اعتمادی موجود ہے۔ گجرات کے تانڈو ناچ کے منظر کو درشاتی یہ نظمیں محض واقعات کی کتھونی نہیں بلکہ تاریک مستقبل کا اعلامیہ ہیں۔بیسویں صدی کی آخری دہائیوں سے تعلق رکھنے والی شاعرات جیسے بلقیس ظفیر الحسن، رفیعہ شبنم عابدی، شہناز نبی، شبنم عشائی، عذرا نقوی، عذرا پروین، کہکشاں تبسم کی نظموں میں فسادات کی بھڑکتی آگ،اس کی بھینٹ چڑھتی گنگا جمنی تہذیب، دم توڑتی انسانیت، ماؤں کے بے بسی اور ہوس کا نشانہ بنتی جوانیوں کی روداد رقم ہے۔شاعرات نے تاریخ و تہذیب کے خون آلود دامن اور گلی گلی میں ڈیرا ڈالی ہوئی درندگی پر سوالات کھڑے

کئے ہیں۔ یہ احتجاج اس عورت کا ہے جو ماں، بہن بیوی ہی نہیں بلکہ خاندان کی اہم فرد ہے۔ اپنی نظم میں رفیعہ شبنم نے ماؤں اور کنواریوں کے درد کو زبان عطا کی ہے۔

کہوں کس سے/فضا بارود کی بو سے متعفن ہے/تو بچے خوف سے/ماؤں کے سینے ڈھونڈتے کیوں ہیں؟ کہوں کس سے/اک شب کی بیاہی دلہنیں مانگوں کی افشاں کیوں چھڑاتی ہیں/کہ مائیں کس کی خاطر دستِ لرزیدہ دعاؤں میں اٹھاتی ہیں/کہوں کس سے؟/کس سے کہوں؟ کیوں کر کہوں آخر؟/فضا میں ہر طرف اک دھُند ہے، کہر/لہو کا ہے/عجب اک شور ہے آواز سناٹوں سے پیدا ہے۔(ناگفتنی.....رفیعہ شبنم عابدی)

یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ ہمارے ملک کی زعفرانی سیاست نے جمہوری نظام کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ بھاگلپور ہو کہ گجرات درندگی کی رقص گاہ بن چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناہید اختر جیسی گوشہ نشین شاعرہ کے مجموعہ کلام ''جراحتوں کے پھول'' میں فسادات سے متعلق ایک باب ''بھاگلپور نامہ'' کے نام سے شامل ہے۔ ان کی نظمیں ہوں یا غزلیہ اشعار اس کا ہر لفظ فساد زدہ شہر کے ان کربناک لمحوں کو گواہ ہے۔ یہ تصویریں مجبور بیٹوں، بے بس بھائیوں خوف زدہ ماؤں اور لرزتی کنواریوں کی ہیں۔ شاعر ان بے چین روحوں کی داستان بیان کرتے نہیں تھکتیں۔ در اصل یہ واقعات ہمارے ملک کی تاریخ کا سیاہ باب ہیں جو دردمندوں کی بے چینی کا سبب بن گئے ہیں۔

جلے مکان، بجھا شہر، کوچے کوچے میں
کٹے ہوئے سروتن کے لگے ہوئے انبار
شناخت لاشوں کی کرنے میں وہ بھٹکتے لوگ
تلاش بیٹے کو تھی ماں کے ایک پاؤں کی
کہ ایک پیرہلا دوسرا نہیں ملتا
ادھورے جسم کی تدفین کس طرح کرتے

یہ اخبار کی سنسنی خیز خبریں نہیں بلکہ دل سے نکلی آہیں ہیں۔ سہل انداز میں بیان کئے گئے تجربے و مشاہدے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک اضطراری کیفیت پنہاں ہے۔ جبر و تشدد جھیلنے والوں کا کرب شامل ہے۔ اس کے برعکس ایک اور شاعرہ عذرا پروین کا احتجاجی لہجہ اس درندگی کو بیان کرتے ہوئے مزید تلخ ہو جاتا ہے۔ ان کے مجموعے ''بارہ قباؤں کی سہیلی'' میں شامل ایک نثری نظم بے حس سماج کے گال پر جڑا گیا طمانچہ ہے تو ان کی ایک اور نظم ''میں ہندوستان ہوں بھارت ہوں'' کی رجز یہ لے قاری کو جھنجھوڑتی ہے۔

تندوری بھارت زندہ ہے/دیکھنے کے لیے سورت میں زندہ گلے میں جلتے ٹائر کے/ننگے بدن کا رقص/جلتی دوڑائی گئی ننگی عورتوں کا نام بھارت ہے/بہت عادت ہے ہمیں کوئی نئی چیز ایجاد دکھاؤ/ہمارے گھر میں بھی کیبل ہے/

میں خون میں لت پت دلّی ہوں
میں آگ میں لپٹا سورت ہوں
میں بدبو دیتا ملیانہ
میں اشکوں روتا میرٹھ ہوں
میں بھاگلپور کا آنسو ہوں
میں ہندوستان ہوں بھارت ہوں

یہ نظم خون میں لت پت بھارت کا نیا تعارف نامہ ہے لیکن عذرا کی مذکورہ بالا دونوں نظموں کے شعری محرکات سے قطع نظر ان کا اشتعال انگیز لہجہ فنی تقاضوں کے منافی ہے۔ غرض ہماری نسائی شاعری کے کینواس پر خون میں نہائے ہوئے شہروں کے نقوش نظر آتے ہیں۔ اس سرمایے میں سیاسی سازشوں کی مرکز بنی وادیٔ کشمیر کا لہو رلانے والا منظر قید ہے۔ جہاں زعفران کی نہیں انسانوں کی فصل کاٹی جانے لگی ہے۔ اس برفیلی وادی میں کئی دہوں سے

بربریت کا سکہ چلتا رہا ہے۔ کشور ناہید اور ساجدہ زیدی نے اس جنت نشان وادی کے پرسوز حالات کا ذکر کیا ہے۔ خصوصاً شبنم عشائی، ترنم ریاض اور رخسانہ جبین اپنے تازہ زخموں کا حساب کرتی نظر آتی ہیں۔ شبنم عشائی کی نظم ''چالیسواں دن ہے کرفیو کا'' میں حالیہ واقعہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نوعمر طالبہ کی آنکھوں کو بے نور کرنے والے منہ زور سپاہیوں کی درندگی پر شاعرہ نے قلم اٹھایا ہے۔

ہم بچوں کو خواب نہیں دیتے / ان کے آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں/ ناشپاتی کے باغوں میں/ پیلی قبریں دِکھتی ہیں/ قدرت کے آنکھ سے/ آنسو ٹپک رہے ہیں/ یہ آنسو/ مٹی کو گیلا نہیں کرتے/ زمین کے ہونٹ سوکھ رہے ہیں/ اس کی پلکوں پہ/ ہیولا جم رہا ہے/ یا الٰہی اب کے/ زمین کا سینہ چاک کردے جہاں پلیٹ گن سے بچی نظریں/ پناہ لیں

نسائی شاعری کی ایک اہم خوبی تجسیم کاری ہے۔ اس نظم میں شاعرہ نے زمین کو مجسم کیا ہے۔ زمین جو ماں کے مماثل ہے وہی ایک آخری سہارا ہے۔ افسوس کی آج اس قسم کے وحشیانہ واقعات برصغیر کا مقدر بن گئے ہیں۔ ایک جانب مذہبی تعصب کا بازار گرم ہے تو دوسری جانب انتہا پسند اور مسلکی عقائد کے جنونی عورتوں کی عزت پارہ پارہ کرکے اور معصوموں کے خون سے اپنی دیوانگی کی آگ بجھا رہے ہیں۔ تانیثیت کی علمبردار شاعرہ کشور ناہید ہو کہ اردو کی نئی بستیوں میں بسی بعض شاعرات باغیانہ تیور کے ساتھ حقائق کو پیش کرنے سے نہیں ڈرتیں۔ فسادات کے نتیجے میں بے ردائی عورت کے حصے میں آتی ہے۔ ذلت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ تار تار ہوتی عزت اور اس کی کھیتی میں بوئے گئے جبریہ بیج کو وہ سینچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کشور ناہید کی نظم ''خوف کی دستک، اور ثمینہ تبسم کی نظم ''ریپ'' میں جسمانی اذیت ہی نہیں روحانی کرب بھی شامل ہے۔ یہ نظمیں اپنے لہجے اور مزاج کے اعتبار سے تانیثی رویے کی مثالیں ہیں۔

دہشتوں کے نگر میں تو نیند نہیں آتی ہے/ بھلا خواب کیسے آئیں گے بے موت مرنے والوں کے نام تو/ بے نام سپاہیوں کی فہرست میں بھی/ درج نہیں ہوتے/ تزلہ سے کراچی تک کوکھ جنون کی/ سنبھالتی مائیں/ اپنی انگارہ آنکھوں کے علاوہ کیا دے سکتی ہیں/ پوچھنے پر بھی تو نہیں بتا سکتیں/ مارنے والے دشمنوں کا نام کیا تھا (خوف کی دستک۔۔۔ کشور ناہید)

میں اس کی ذات میں برپا/ جو وحشتناک بربادی ہے/ اس سوچ کے/ خود اپنے اندر مر رہی ہوں کبھی ممتا فتح پاتی ہے/ تو اک ماں کی چاہت دیکھ کر/ آنکھوں کے کھارے پانیوں سے زخم لگتے ہیں/ مگر اکثر ممتا ہار جاتی ہے/

کبھی میں ملک کے قانون کو الزام دیتی ہوں/ کبھی فتوؤں کے ڈر سے اپنے منہ کو باندھ لیتی ہوں/ کسی اجنبی درندے کی ہوس کو گود میں لے کر/ خلا میں گھورتی پاگل سی لڑکی/ سچ کا وہ بھاری طمانچہ ہے/ جو ہر اک سوچنے والے کے منہ پر روز لگتا ہے

(ریپ۔۔ ثمینہ تبسم)

برصغیر میں آج بھی نفرتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ تشدد کی آگ بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ آئے دن رونما ہونے والے واقعات سے نئی نسل بے بہرہ نہیں ہے۔ ان کی شعری تخلیقات سے ذاتی تاثر اور تخلیقی اُپج کا احساس ہوتا ہے۔ شاعرات اپنے ملک سے دور سہی لیکن ان کا رشتہ اپنی زمین سے برقرار ہے۔ لرزہ بر اندام واقعات پر ان کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ ثمینہ تبسم کی نظمیں ''پہلی محرم'' اور ''موت شیعہ سنی نہیں ہوتی'' ''مسلکی منافرت کی مثالیں ہیں جبکہ ثروت زہرا نے اپنی نظم ''وقت کا نوحہ'' میں بارود پر بیٹھی دنیا کا حال بیان کیا ہے۔ بے قصور اور معصوم بچوں کی زندگیوں سے

کھلواڑ کرنے والوں کے مشغلہ کو نشان زد کیا ہے۔ سنبل بلوچ کی نظم بھی ایسے ہی ایک واقعہ پر مرکوز ہے۔

ایک دھماکہ کچھ لاشیں سب وہی پرانا منظر/ایک خبر چلتی ہے لفظوں کا بُل ڈوزر/سارا ملبہ سمیٹ کے آگے بڑھتا ہے/بریکنگ نیوز کے رستوں سے کچھ سنجیدہ درپیش مسائل کی جانب/کون بھلا اس منظر کے پاتال میں اترے؟ کون بھلا یہ دیکھے کس کا چہرہ مسخ ہوا ہے/کون بھلا جسموں کے ٹکڑوں میں بٹ کر بھی اپنا آپ سمیٹ سکے/کون بھلا اب لاوارث کے درد کو محسوس کرے

(SBK کی شہید طالبات کے نام۔۔۔سنبل بلوچ)

نہ جانے کس طرح وحشی درندوں نے/جواں بیٹیوں کی ماؤں کے جگر کاٹے/نہ جانے کیسے پھولوں کو مسل ڈالا/نہ جانے کونسی مٹی میں ان کے لعل جا پائے/برس گزرے/مگر اب بھی/مجھے تو ایسا لگتا ہے/ستارے ٹوٹ کر کچھ آسماں سے آ گئے ہیں/اگر ایسا نہیں تو پھر/مدرسے جا رہے بچوں کے یونیفارم پر/یہ خون کے دھبے کہاں سے آ گئے ہیں/ (پشاور اٹیک۔۔۔۔اسنیٰ بدر)

مذکورہ بالا پہلے اقتباس میں الیکٹرانک میڈیا کی سحر طرازی پر طنز ہے۔ آج خوں ریز واقعات بھی بے معنی بن گئے ہیں۔ لفظوں کا بل ڈوزر ان دلدوز مناظر کو سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ لاوارث کے درد کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ دوسرے اقتباس میں شاعرہ فسادی ذہن کی حرکتوں پر حیران ہے۔ ممتا کے چہرے پر خوف کی پرچھائیوں کا ڈیرا ہے۔ ان لہو رنگ نسائی نظموں کا باب عشرت آفریں کی طویل نظم ''یہ بستی میری بستی ہے'' کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ڈرامائی تکنیک میں لکھی گئی نظم اپنے مزاج کے اعتبار سے منفرد ہے۔ نظم کے نصف حصے میں بچپن اور جوانی کے مختلف کردار اور حسین واقعات، مذہبی اور تہذیبی رسوم پس منظر کے طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ نقطۂ عروج کی صورت میں ایک واقعہ کے ذکر سے نظم کی ساری فضا بدل جاتی ہے۔ نظم کے اقتباسات ملاحظہ ہوں مگر یہ میرے ہمجولی/یہ جس گولی کی باتیں کر رہے ہیں/اس میں/چنگاری ہے اور بارود کی بو ہے/ابھی/بالکل ابھی/میں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے/کہ منظر کیسے بدلا ہیلو ہاری گیٹ ہو/یا گوٹھ قاسم کی کوئی بستی/وہ باب العلم ہو/یا مسجد صدیق اکبر ہو/حسین آباد ہو/یا وہ مری فاروق نگری ہو جہاں بھی گولیاں چلتی ہیں/میرے دل پہ لگتی ہیں/ہر اک وہ گھر/جہاں ماتم بپا ہے/میرا اپنا ہے/یہ جتنا خون بھی اب تک بہا ہے/میرا اپنا ہے/مقدس خاک پہ بکھرے ہوئے/ادھڑے ہوئے اعضا/جنوں کی آگ میں جھلسا ہوا/ہر لاش کا چہرہ اگر پہچان مشکل ہے تو میرا نام لکھ دینا/یہ میرے اعضا ہیں/یہ چہرہ میرا چہرہ ہے بہر کیف نسائی نظمیہ شاعری میں جہاں تانیثیت کا تلاطم بپا ہے وہیں لہولہان واقعات کی موجیں سر پٹکتی نظر آتی ہیں۔ ان نظموں کا تانا بانا چابکدستی سے تیار کیا گیا ہے۔ ان میں انگریزی الفاظ کا استعمال تازہ کارتراکیب، تلمیحات اور استعارات کا حسن، شاعرات کے تخلیقی مزاج کا ثبوت ہے۔ زہرا نگاہ نے اپنی نظم میں اسلامی تلمیح کے ذریعہ عالمی سیاستدانوں کی جہالت کو بے نقاب کیا ہے کہکشاں تبسم نے بھاگلپور سیریز کی پانچ مختصر نظموں کے علاوہ موجودہ عالمی منظرنامے سے متعلق کامیاب نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان کی ایک نظم میں داستانی کردار 'شہرزاد' کے استعاراتی عمل سے معنویت کے در وا ہو جاتے ہیں۔ شاعرہ کی یہ فکر بے حس ماحول کے تئیں جذباتی ردعمل نہیں بلکہ اس کے سیاسی شعور کا غماز ہے۔ شعری اقتباسات سے عالمی منظرنامہ کا حصہ ہیں۔ ان کے علاوہ تبسم فاطمہ کا توانا اور ظرف کاری لہجہ ہماری فکر اور جذبے کو مہمیز کرتا ہے۔

ہزاروں بوجہل کے ہاتھ میں/آتشیں وہ عصا ہے/جس کی آواز دہشت ہے/کرب و بلا ہے/میرے معبود تیرا یہ ارشاد ہے/اب

پیمبر نہیں آئیں گے/ پھر بتا ان کو روکے گا کون؟/ آتشیں ان کے ہتھیار/اب ان سے چھینے گا کون

(ہزاروں بوجہل۔۔۔ز ہرا نگاہ)

چرند سارے، پرند سارے/درند سارے/ بہ شکل انساں/ رزم گاہِ فنا میں اترے/لہو کی چھاگل/ سے گھونٹ بھرتے/ز میں پہ لاشے بچھا رہے ہیں/جوان بچے، بزرگ سب ہیں/ نہ مرد وزن کا شمار ہے کچھ/دہک رہا ہے شعلہ زا ہے کچھ/نہ شہر یار صدی کوئی ہے/اگر کوئی ہے/تو شاید اس کی سماعتیں بھی/ بصارتیں بھی/ جسارتیں بھی/ صدائے گریہ/ہجومِ غوغا کو سن کے مفلوج ہو چکی ہیں

(رزم گاہِ فنا۔۔کہکشاں تبسم)

تاریخ کے جدید صفحات پر/اب مارے جانے والوں کی نئی شناخت لکھ دی گئی ہے/اب مذہب کا ڈی این اے بمباری کرنے والوں کے راستے کو آسان کر رہا ہے/روتے بلکتے ہوئے لوگوں کا ایک جمِ غفیر ہے/ عالمی سیاست خاموشی سے ان کی قبر تیار کرنے میں جٹی ہے/ سیاست کے اداس صفحات پر/ تماشہ دیکھتے ہوئے عرب حکمران/ ابھی تک امریکہ اور اسرائیل کی یقین دہانی پر/ اجتماعی عیّاشی کے فرمان کی دارو پی رہے ہیں/وہ بے خبر ہیں کہ اقتدار کے یہ ڈائنا سور ایک دن/خاموشی سے ان کا بھی قتل کر دیں گے

(روہنگیائی انسانوں کے نام۔۔تبسم فاطمہ)

عموماً مرد اساس معاشرت کے تئیں خواتین کے باغیانہ تیور ہی کو نسائی شاعری کی شناخت قرار دیا گیا۔ان کی سیاسی وسماجی بصیرت پر کم کم ہی گفتگو کی گئی۔ عالمی تشدد اور نسل کشی سے متعلق شاعرات کا جوردِّ عمل رہا اس کا کسی نے نوٹس نہیں لیا اور نہ ہی مجموعی طور پر ان کی بصارتوں اور جسارتوں کو موضوع بحث بنایا گیا۔ نسائی نظموں کے اس موضوعاتی مطالعے سے عصری شعور کی حامل خواتین کا وجود ابھر کر آتا ہے۔ہم انہیں صرف تانیثیت کے حصار میں قید نہیں کر سکتے۔ جہاں تک عصری غزل کی بات ہے اس صنف میں تشدد اور فسادات کی ہولناکی کو ایک اہم موضوع قرار دیا گیا۔ دور حاضر کی شاعرات نے غزل کی رفتار کا ساتھ دیا ہے۔عصری موضوعات کو کامیابی سے برتا ہے۔ انہوں نے غزل کے مخصوص الفاظ اور تلازموں کا رشتۂ روایت کے بجائے عصریت سے وابستہ کیا ہے۔ نسائی غزل میں جہاں عورت کے وقار اور استحصال کا ذکر کیا گیا وہیں قیامت خیز مناظر کو بھی قید کیا گیا۔ غزلیہ اشعار میں قتل، قتل گاہ، قیامت، جنازے جیسے مخصوص اسماء کے علاقے بدل گئے ہیں۔خنجر بکف ہوا، عداوت کی چتائیں، جہنم زار فضا، لہو کی رت، خوف نادیدہ جیسی تراکیب فضا کو پر اثر بنانے میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔گھر، نگر، گلی، کوچے، شہر، بستی، سڑک، زمین، جنت، آنگن یہ سارے اسمِ مکان ان اشعار میں کلیدی الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔بلقیس ظفیر الحسن، شاہدہ حسن اور رخسانہ جبین کی غزلوں میں مستعمل ردیف و قوافی اجتماعی درد کے مظہر ہیں۔

ہے وحشت کو بہ کو دہشت بھرے گھر دم بخود جینا
کہیں کس منہ سے کہلاتا ہے یہ اپنا نگر جنت
یہ گولا آگ کا، بنتی ہوئی دھرتی ہے وہ دھرتی
جسے جنت بنانے آئے آدم چھوڑ کر جنت

(بلقیس ظفیر الحسن)

یہ سجدہ گاہیں یہ عرش ومنبر جو ہیں ہمارے خون سے تر
لہو کی یہ رُت ٹھہر نہ جائے ہوا قیامت کی چل رہی ہے
یہ کن دُکھوں میں سلگ رہے ہیں، دماغ بارود لگ رہے ہیں
رگوں میں زہر بھر نہ جائے، ہوا قیامت کی چل رہی ہے

(شاہدہ حسن)

اک شر رہی ان کے ہاتھوں میں نظر آتا نہیں
آتشیں کیونکر ہوئی جاتی ہے برفیلی زمیں

سوچ لو اک اور قتلِ عام ہونا ہے ابھی
ہے ہوا خنجر بکف اور خون کی پیاسی زمین
(رخسانہ جبین)

منقولہ اشعار میں لہو کی رُت کا ٹھہر جانا، ہوا کا قیامت کی چال چلنا، دماغ کا بارود ہو جانا، برفیلی زمین کا آتشیں ہونا، خون کی پیاسی زمین کا خنجر بکف ہونا، یہ سارے مجرد تصورات کی تجسیم کاری فضا کی ہولنا کی میں اضافے کا باعث ہے۔ ان لہولہان مناظر کی پیش کش میں شاعرات کے بیانات کی بنیاد تخیل پر نہیں مشاہدے پر رکھی گئی ہے۔ جذبات کے اظہار کے لیے جو بصری پیکر تراشے گئے ہیں وہ نہ صرف قاری کے حواس کو متحرک کرتے ہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو ان مناظر کا ناظر محسوس کرنے لگتا ہے۔

ہر شہر ہوا شعلہ فشاں، ہر سمت دھواں گھنگھور دھواں : جھلسے جھلسائے چہروں میں پہچان کسی کی پائیں کیا (ناہید اختر)

گرم تھی بس یہ خبر ہے شہر میں وہ ان دنوں :
پھر گلی کوچوں میں خوں برسا قیامت ہوگئی (رفیعہ شبنم)

میں بچ بھی جاؤں گی تو تنہائی مار ڈالے گی :
مرے قبیلے کا ہر فرد قتل گاہ میں ہے (پروین شاکر)

بجھی ہوئی ہنسی، جلے ہوئے گھروں کے خدوخال:
کسی نئے سوال کا کوئی نیا جواب ہے (حمیرا رحمٰن)

یہ کس نے مل دی ہے بے دردی سے کالک :
زمیں چہرہ لہو سے دھو رہی ہے
(سیما عابدی)

یہ کس نے عداوت کی سجائی ہیں چتائیں:
کیوں بستی ابھی سے مری شمشان ہوئی ہے (شہناز نبی)

خون آشام ہواؤں کا سندیسہ لکھوں :
یا کسی جلتے ہوئے شہر کا قصّہ لکھوں

جشنِ بارود سے تھا شہر چراغاں اس شب :
عکس شعلوں کا دکھا تا رہا دجلہ لکھوں (عذرا نقوی)

زندگی کو قطرہ قطرہ رات دن پیتے رہے :
ہم لہو کے شہر میں اک عمر تک جیتے رہے (کہکشاں تبسم)

ہوا کی سازشیں بڑھنے لگی ہیں :
کہاں دھرتی پہ کوئی گھر سلامت
(کہکشاں تبسم)

اے زندگی گزرنا ہماری گلیوں سے :
ابھی ہمارے جنازے گھروں میں رکھے ہیں
(رخسانہ جبین)

جہاں بھی دیکھوں وہیں رک کے تکنے لگتی ہوں:
کہ ہر اُجاڑ کھنڈر اپنا گھر لگے ہے مجھے
(رخسانہ جبین)

گھر غزل کا مقبول استعارہ ہے۔ ان منقولہ اشعار میں گھر عاشق کا مسکن نہیں یہ عائلی رشتوں اور اجتماعی زندگی کا مرکز ہے۔ افسوس اس کا اجڑنا سماجی تاراجی کی علامت ہے۔ گھر ہو کہ شہر مہذب اور ترقی یافتہ سماج کی نشانی ہے۔ آج وہ سارے نقوش دہشت گردی کی نذر ہونے لگے ہیں۔ ان اشعار سے نہ صرف مظلوموں کی بے چینی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان میں جراحتوں کے پھول کھلے نظر آتے ہیں۔ بہر حال نسائی شاعری کے اس موضوعاتی مطالعے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ شاعرات نے اپنے آپ کو سماج کی ایک زندہ اکائی ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اب وہ جاگتی آنکھوں سے ان خوفناک مناظر کو دیکھ کر گھبراتی نہیں بلکہ اس بے حس سماج کو آئینہ دکھانے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ یہ حوصلہ یہ قوت ان کے شعور کی بیداری پر دال ہے۔

☆☆☆

مضمون

# انتظار حسین کا آخری آدمی: تقلیبِ آدم کا بیانیہ

انتظار حسین کا شمار برصغیر کے مایہ ناز فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کے موضوعات اور منفرد نوعیت کے انداز و اسلوب کی وجہ سے اپنے معاصرین میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی کہانیاں داستانوں کی یاد دلاتی ہیں۔ تمثیلی اور اساطیری کہانیاں ان کے فکشن کا خاصہ رہی ہیں۔ انتظار حسین کے قصے کہانیوں کا مرکز ومحور ماضی کی یادیں، مادر وطن کی تہذیب وثقافت، ہجرت اور اس کے المیے کا بیان رہا ہے۔ وہ ماضی کے بغیر حال اور مستقبل کے تصور کو ادھورا سمجھتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں میں تہہ داری پائی جاتی ہے جو قاری کو دعوت فکر دیتی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں کے نام گلی کوچے، کنکری، آخری آدمی، شہر افسوس، کچھوئے، خیمے سے دور اور خالی پنجرہ ہیں۔

''آخری آدمی'' انتظار حسین کا مشہور افسانہ ہے۔ اس افسانے کا ماخذ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ انتظار حسین کے اس افسانے کا ماخذ قرآن کے سورہ ''البقرہ اور الاعراف'' میں مذکور ایک بستی کا واقعہ ہے۔ پہلے سورۃ الاعراف کا متعلقہ ترجمہ ملاحظہ ہو:

> ''اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انہیں یاد دلاؤ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لیے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے۔''

(سورۃ الاعراف، آیت 166-163۔ ترجمہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

سورۃ بقرہ کی متعلقہ آیات کا ترجمہ یہ ہے:

> ''پھر تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہی ہے جنہوں نے سبت کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انہیں کہہ دیا کہ..... بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے۔''

(سورہ البقرہ۔ آیت نمبر 65۔ ترجمہ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

قرآن میں لوگوں کے بندر بننے کا جو ذکر موجود ہے وہ دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا واقعہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو سبت کے روز مچھلیوں کے شکار سے منع فرمایا کرتے تھے لیکن وہ قوم اتنی سرکش تھی کہ باوجود منع کرنے کے شکار کرنے سے باز نہیں آتی تھی۔ ایسا نہیں کہ شریعت میں مچھلیوں کا شکار حرام تھا۔ حرام نہیں تھا، بس ان کے ایمان کی آزمائش کی خاطر سبت کے دن شکار کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ چونکہ یہ ممانعت آزمائش کی وجہ سے تھی اس لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس دن کثرت سے مچھلیاں سطح آب پر آتی تھیں۔ جب وہ لوگ مچھلیوں کو اتنی کثیر تعداد میں اوپر دیکھتے تو اپنے آپ کو روک نہیں پاتے اور حکم عدولی کر بیٹھتے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو سزا کے طور پر بندر بنا دیا۔

غور طلب ہے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے اور قرآن میں اس کا ذکر ہے جبکہ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب ''توریت'' ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر صرف اس لیے آیا ہے کہ لوگ عبرت حاصل کر سکیں۔ یہاں یہ ذکر بھی بے جا نہ ہوگا

کہ صرف حضرت موسیٰ نہیں بلکہ پچھلے کئی پیغمبروں کے نام اور ان کی امتوں کے تذکرے قرآن میں آئے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ پچھلی امتوں کے واقعات پڑھ کر عبرت حاصل کریں۔

انسانوں کے بندر بننے کا یہ وہ واقعہ ہے جسے انتظار حسین نے بنیاد بنا کر اپنا افسانہ ''آخری آدمی'' تخلیق کیا جس کا ثبوت افسانے کے دوسرے پیراگراف میں واضح طور پر ملتا ہے۔ افسانہ بیانیہ اور فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ اس میں بیک وقت دو واقعات آگے بڑھتے ہیں۔ ایک افسانے کے فنی تقاضے کے پیش نظر مرکزی کردار ''الیاسف'' کے حوالے سے اور دوسرا اس حقیقی قرآنی کہانی سے متعلق جس میں مچھلیوں کا شکار کرنے کی وجہ سے انسان بندر بن جاتا ہے۔ یہاں پر افسانہ نگار کی فنکارانہ چابکدستی کی داد دینی ہوگی کہ انہوں نے آگے چل کر دونوں کہانیوں کو غیر محسوس طریقے سے ضم کر دیا ہے۔ انتظار حسین کا اسلوب مجموعی طور پر کلاسیکی لب و لہجے میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ زیر بحث افسانے میں اُن کی زبان قرآنی واقعے کی مناسبت سے مذہبی تیور لیے ہوئے ہے جہاں خطابیہ انداز ہے وہاں الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب بھی وہی استعمال کیے گئے ہیں جو عموماً قرآن کے تراجم یا اس کی تفسیر و توضیح میں اختیار کیے جاتے ہیں۔

''آخری آدمی'' میں دراصل انسان کے عقل پر نفس کے حاوی ہونے اور انسانی قدروں کی پامالی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس قسم کے موضوع سے متعلق ان کا ایک اور افسانہ ''زرد کتا'' بھی ہے۔ آخری آدمی کے ابتدائی حصے ہی میں تخلیق کار نے ایک شخص کو ہنسنے کی وجہ، دوسرے کو حیرت کی وجہ سے، تیسرے شخص کو خوف کی وجہ سے اور چوتھے شخص ابن زبلون کو غصے کی وجہ سے بندر بنتے ہوئے دکھایا ہے۔ حالانکہ حیرت کرنا، ہنسنا، خوف زدہ ہونا اور غصہ انسانی جبلت میں شامل ہے لیکن ان تمام خصوصیات کا اعتدال میں نہ رکھ پانا اور شدت کے بہاؤ میں بہہ جانا بھی دراصل انسانیت کے بلند شعار کے منافی ہے۔ افسانے میں اس طرف بلیغ اشارے کیے گئے ہیں کہ جس طرح حضرت موسیٰ کی قوم حرص و ہوس کا شکار ہو کر بندر بنی تھی ٹھیک اسی طرح آج کا انسان اپنے جذبات و احساسات، اپنے نفس اور ضمیر پر قابو نہ رکھ پانے کی وجہ سے انسانی قدروں سے دور ہو رہا ہے، اور ان بنیادی خوبیوں سے، جن کی وجہ سے اسے اشرف المخلوقات کہا گیا تھا، بہت دور جا چکا ہے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار الیاسف اپنے ہم جنسوں میں سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ وہ جب لوگوں کو اپنی شناخت کھوتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ اپنی قوم کے رہبر اعظم کے پاس جاتا ہے تاکہ کچھ حل تلاش کیا جا سکے لیکن جب وہ وہاں پہنچتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ دنیا سے جا چکے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا اور حلقہ زن ہو کر دیر تک پکارا کیا۔ تب وہ وہاں سے مایوس پھرا اور بڑی آواز سے بولا کہ اے لوگو وہ شخص جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا کرتا تھا آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

مچھلیاں پکڑنے سے منع کرنے والا شخص ان کی قوم کا رہبر ہے اور وہ جا چکا ہے۔ اب ان کا موجودہ قائد کون ہے؟ ایک طرح سے یہی مسئلہ ہمیں بھی درپیش ہے کہ اب ہمارے روحانی قائدین دنیا میں نہیں رہے۔ اور قائدین نہیں رہے اس لیے روحانیت کا فقدان ہو گیا۔ اس قریے میں رہنے والے لوگوں کی صورتیں چپٹی ہو گئیں، خد و خال مسخ ہونے لگے اور وہ بندر بنتے چلے گئے۔ دراصل انسان کی بے ضمیری، بے حسی اور حرص و ہوس نے اُنہیں آ گھیرا۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکے اور اپنی شناخت کھو بیٹھے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب انسان اعتدال وتوازن برقرار نہیں رکھ پاتا تو اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔

الیاسف اس قریے کا عقلمند آدمی ہے۔ آدمی ہی کے جون میں رہنا' آدمی کے جون میں مرنا اس کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ وہ جذبات واحساسات' نفس اور خواہش سے خود کو بچانے کی بہت کوشش کرتا ہے۔ الیاسف کی کوشش اور اس کی جبلی تقاضوں کے درمیان زبردست تصادم ہے۔ یہ تصادم قاری کی دلچسپی اور جستجو میں اضافہ پیدا کرتا ہے۔ انتظار حسین نے اس تصادم میں جبلی قوت اور فطرتِ انسانی کی فتح دکھائی ہے۔ الیاسف بھی اس جدوجہد میں بالآخر ناکام ہوتا ہے۔ اس قریے والوں کو حکم تھا کہ ''سبت کے روز مچھلی نہ کھانا'' لیکن اس کی تعمیل کسی نے نہیں کی۔ البتہ الیاسف نے ایک الگ ترکیب وضع کی۔ سمندر سے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اُسے سمندر سے ملا دیا۔ سبت کے روز بہت سی مچھلیاں سطح آب پر آئیں اور وہاں سے تیرتی ہوئی گڑھے میں بھی آ گئیں۔ دوسرے روز الیاسف نے گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑ لیں۔ ظاہر ہے کہ اُس نے یہ جواز اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے گڑھ لیا تھا کہ سبت کے روز سمندر سے مچھلیاں نہیں پکڑیں۔ دراصل تخلیق کار نے اس خاص طبقے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب واعظ' مبلغ' مفکر' دانش مند ہی مکر وفریب کرنے لگیں۔ نئی نئی حکمت عملیاں اختیار کریں' خود ہی اصول وقوانین کی من مانی تاویل کرنے لگیں تو پھر ان پر عمل کرنے والا کون بچے گا۔ ایسی صورت میں آج کے انسان میں بے ضمیری اور بے حسی کا ہونا لازمی ہے جس کا واضح اثر معاشرے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی سوال ہے کہ الیاسف نے ایسے جواز کی تلاش کس کے لیے کی۔ اس سے سوال کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اس نے یہ ترکیب اس کے لیے کی جو سب کچھ دیکھتا ہے۔ سات پردوں کے اندر بھی دیکھتا ہے۔ لیکن الیاسف یہ بھول گیا کہ وہ ہر بات کی تہہ کو جاننے والا ہے:

''جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے۔''

اس قریے کو سمجھانے والے نے کہا تھا کہ:

''بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔''

الیاسف تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اس کی شخصیت دو خانوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک داخلی اور ایک خارجی۔ اسے پوری ہستی مکر نظر آنے لگی۔ وہ خدا سے دعا کرنے لگا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کی ہیئت میں تبدیلی کا آغاز ہو گیا جس کے احساس سے وہ سہم گیا۔ فکر اور جسمانی اعضا میں تبدیلی کے احساس میں توازن رکھنا مشکل ہونے لگا۔ آنکھیں بدن سے نظریں چرانے لگیں۔ ہر لمحے اسے احساس ہونے لگا کہ اس میں بتدریج تبدیلی ہو رہی ہے۔ یہ کشمکش افسانے کی جان ہے اور انتظار حسین کی بے پناہ صلاحیتوں کا بین ثبوت ہے۔ انسان سے حیوان بننے کا عمل کافی تکلیف دہ ہے۔ اقتباس دیکھیے:

''الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنویں میں دھنستا جا رہا ہے اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا کہ اے میرے معبود میرے باہر بھی دوزخ ہے۔ اندھیرے کنویں میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی صورتوں نے اس کا تعاقب کیا اور گزری راتیں محاصرہ کرنے لگیں۔''

ایک جگہ افسانہ نگار کا یہ کہنا کہ ''افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کے مثال رہ گیا'' انسانی رشتوں کی

شکست و ریخت اور زبان کی تاثیر ختم ہوجانے کی طرف اشارہ ہے۔ آج انسان ریاکاری اور تصنع پسندی کی وجہ سے لفظوں کے اثر و تاثیر سے محروم ہوتا جارہا ہے۔

الیاسف آخر تک آدمی بنا رہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کو بندر بنتے دیکھ چکا ہے۔ جن اسباب کی وجہ سے وہ بندر بنتے ہیں الیاسف ان اسباب کو اپنی مدافعت کے طور پر استعمال کرتا ہے اور ہر طرح کے جذبات سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے لیکن آخر میں وہ انسانی کمزوریوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ اُسے نفس پر قابو نہیں رہتا ہے اور وہ بنت الاخضر یعنی جنس مخالف کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور اُس کی یادوں میں مبتلا ہوتا ہے۔

افسانے کے آخری حصے میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ انسان اپنی انسانیت کھو چکا ہے۔ وہ حیوانگی اور درندگی کے قریب پہنچ چکا ہے لیکن اس کو احساس ہی نہیں ہے کہ وہ انسانیت کے اعلیٰ ترین مدارج سے بہت نیچے آچکا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہاں سبھی ایک ہی طرح کے ہیں۔ سبھوں کا شیوہ یکساں ہے اور سبھوں کا حال برا ہے۔ کون کس کو بتائے کہ تم ''احسن تقویم'' سے بہت نیچے آچکے ہو۔ تبھی تو الیاسف باوجود تمام کوشش کے بندر بن گیا لیکن اسے کون بتائے کہ تم بندر بن چکے ہو۔ وہ اپنے آس پاس کسی سے پوچھنا چاہتا ہے کہ وہ کس ''جون'' میں ہے لیکن وہاں سب پہلے ہی سے انسانی ہیئت کھو چکے ہیں۔ وہ جھیل سے پانی لینے جاتا ہے اور اس پانی میں اپنا عکس دیکھ کر اُسے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ تو بندر بن چکا ہے۔ افسانے کا آخری حصہ ملاحظہ کریں:

> ''بہت دور جا کر اسے ایک جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا۔ جی ٹھنڈا کیا۔ اسی اثنا میں وہ موتی ایسے پانی کو تکتے تکتے چونکا۔ یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا۔ اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔''

اس افسانے کو تین زاویے سے سمجھا جاسکتا ہے:

(i) اسلامی تناظر میں: اس افسانے میں تخلیق کار نے سورۃ الاعراف اور البقرہ کے قصے کو بنیاد بنایا ہے کہ جب گاؤں والوں کو سبت کے روز مچھلیاں نہ پکڑنے کا حکم دیا گیا تو گاؤں کے لوگوں نے اس حکم کے خلاف عمل کیا اور بالآخر وہ بندر بنا دیے گئے۔ الیاسف اپنے جذبات پر قابو کھوتے ہی بندر کی حیوانی شکل میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ یہاں مصنف یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ انسان کبھی بھی تنہا زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اسے ایک ساتھی، ایک ہم سفر کی ضرورت پڑتی ہے جو اس کی جسمانی اور روحانی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ الیاسف نے خود کو آدمی کی جون میں برقرار رکھنے کی آخر تک کوشش کی اور اس میں کافی حد تک کامیاب ہو رہا لیکن وہ خود کو بنت الاخضر کے بغیر ادھورا محسوس کرنے لگا۔ افسانہ نگار نے اس جملے کو بار بار دہرا کر کہ ''اے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ میں تجھ بن ادھورا ہوں۔'' اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان اپنے آپ میں مکمل نہیں ہے۔ اسے ہمیشہ کسی کی ضرورت پیش آتی ہے۔

(ii) علم فلسفہ کے تناظر میں: افسانہ ''آخری آدمی'' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے اور وہ تنہا نہیں رہ سکتا۔ معروف دانشور ارسطو کا قول ہے:

> "Man is by nature a social animal. An individual who is unsocial naturally and not accidentally is either beneath our notice or more than human. Society is something that precedes the individual. Anyone who either cannot lead

the common life or is so self-sufficient as not to need to, and therefore does not partake of society, is either a beast or a god"

(https://www.goodreads.com/quotes/183896)

تخلیق کار ایک جگہ لکھتا ہے:

''الیاسف اپنے حال پر رویا اور بندروں سے بھری بستی سے منھ موڑ کر جنگل کی سمت نکل گیا۔ کہ اب بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری نظر آتی تھی اور دیواروں اور چھتوں والا گھر اس کے لیے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔''

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آدمی کے لیے انسان اور سماج کا ہونا ضروری ہے۔ وہ سماج جہاں انسان پیدا ہوتا ہے۔ پرورش پاتا ہے اور بڑا ہوتا ہے۔ بغیر آدمی اور سماج کے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ چونکہ انسان ''حیوانِ ناطق'' ہے' اسے خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ بولنا' ہنسنا' رونا' غم وغصہ کرنا اور دیگر تمام جذبات واحساسات اس کی سرشت میں داخل ہیں اور ان جذبات کے اظہار کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ زاویہ تفہیم علم فلسفہ سے وابستہ ہے۔

(iii) علم نفسیات کے زاویے سے: افسانہ ''آخری آدمی'' اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ جنسی خواہشات انسان کی فطرت کا لازمی جزو ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنایا جس میں مرد اور عورت دونوں موجود ہیں۔ دونوں کے لیے ایک دوسرے میں کشش کا مادہ پیدا کیا جو ایک فطری عمل ہے۔ تمام جانداروں کو جنس مخالف کے تئیں لگاؤ اور دلچسپی ہونا لازمی ہے۔ مصنف نے اس اہم نکتے کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب الیاسف کو اپنے بیتے دن یاد آتے ہیں اور بنت الاخضر کی یاد اُسے ستاتی ہے تو وہ سوچتا ہے:

''اس نے دیکھا لمبے بال اس کی رات کی بوندوں سے بھیگے ہوئے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں اور پیٹ اس کا گندم کی ڈیوڑھی کی مانند ہے اور پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے اور الیاسف نے بنت الاخضر کو یاد کیا اور ہرن کے بچوں کو گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کے تصور میں سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔''

الیاسف کا بنت الاخضر کے گھر جانا اور اسے تلاش کرنا جنسی خواہشات کے سبب ہے۔ اپنے نفس کی تسکین کی خاطر وہ بنت الاخضر کے گھر تک جاتا ہے۔ مگر وہ اسے وہاں نہیں ملتی۔ آخر مایوس ہوکر وہ خود کو بنت الاخضر کی یادوں سے دور لے جانا چاہتا ہے مگر کامیاب نہیں ہو پاتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح فرمان خداوندی کی خلاف ورزی کے سبب پوری قوم بندر بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ علم نفسیات کے زاویے سے بھی اس کا درک ہوتا ہے کہ انسان لاکھ کوشش کرلے وہ اپنی جبلی قوتوں سے شکست کھا کر ہی رہتا ہے۔ جبلی قوت ہمیشہ انسان کے اوپر حاوی رہتی ہیں۔ انتظار حسین کا شاہکار ''آخری آدمی'' کو اُردو افسانے کی تاریخ میں خصوصی اہمیت حاصل ہے اور یہ دراصل تقلیبِ آدم کا بیانیہ ہے!

## حواشی:

1. انتظار حسین: آخری آدمی
2. ڈاکٹر فرمان فتح پوری: اُردو افسانہ اور افسانہ نگار
3. ڈاکٹر اعجاز راہی: اُردو افسانے میں علامت نگاری
4. پروفیسر ارتضیٰ کریم: اُردو فکشن کی تنقید
5. پروفیسر صغیر افراہیم: اُردو فکشن: تنقید اور تجزیہ
6. پروفیسر گوپی چند نارنگ: انتظار حسین اور اُن کے افسانے

محمد زاہد الحق

مضمون

# شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کی ناقدانہ بصیرت

جہانِ اردو میں جوش ملیح آبادی کو ایک ہمہ داں شخصیت کی حیثیت حاصل ہے۔ ایک طرف انھوں نے اردو شاعری کو بلند آہنگ عطا کیا تو دوسری طرف موضوعات میں گراں قدر اضافے بھی کیے۔ جہاں ایک طرف وہ جملوں کی تراش خراش اور نئی ترکیبوں کی ایجاد میں یگانہ ہیں تو وہیں دوسری طرف الفاظ کے انتخاب اور اس کے تصرف میں وہ یکتائے روزگار ہیں۔ طرز ادا اور اسلوب نگارش میں جوش ملیح آبادی یکاوتنہا ہیں۔ جوش نے اپنی شاعری اور لب و لہجے سے ایک عہد کو متاثر کیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی زندگی میں ہی ان کی شاعری کے حوالے سے بادمخالف اور باد موافق دونوں چلنے لگی تھیں۔ چند ناقدین کو چھوڑ کر کسی نے ان کی شاعرانہ خصوصیات کو دیانتداری اور ذہنی کشادگی سے بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اکثر کو ان کے سرمایۂ شاعری میں لغزشوں اور کوتاہیوں کے علاوہ کوئی قابل ذکر وصف نظر نہیں آیا۔ کچھ ناقدین نے ان کی شاعری میں گھن گرج کے سوا کچھ نہیں پایا اور چند ناقدین نے انھیں شاعر انقلاب اور شاعر شباب کے القاب سے نواز کر اپنا فرض ادا کیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جوش کی شاعرانہ عظمت کا تعین ابھی تک مخلصانہ اور ایمان دارانہ طور پر نہیں ہوسکا ہے۔

جوش کا تخلیقی دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ انھوں نے تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور وہ ہر صنف میں ایک مشاق قلم کار اور منفرد فن کار نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ان کی شناخت بلند آہنگ شاعر کی ہے تو دوسری طرف ان کی پہچان ایک تنقید نگار کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جوش نے تنقید کی طرف بہت کم توجہ دی لیکن جوش کی تنقیدی بصیرت ان کی نثر میں جابہ جا نمایاں ہے۔ 'روح ادب' کا دیباچہ 'یادوں کی برات'، 'کلیم' اور 'آجکل' کے اداریے، خطوط اور مقالاتِ جوش کی صورت میں جوش ملیح آبادی کی جتنی نثری تحریریں موجود ہیں ان کو پڑھنے کے بعد جوش کی تنقیدی آگہی کا اندازہ ہوتا ہے۔

جوش کے تنقیدی شعور کا عکس ان کے اولین مجموعے 'روح ادب' کے دیباچے میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ دیباچہ جوش کے فکری و تنقیدی ارتقا اور ادبی میلانات کو سمجھنے میں بڑا معاون ہے۔ اس دیباچے کے مطالعے کے بعد اتنا ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی اشاعت سے قبل تک جوش کے ذہن میں زندگی اور ادب کا ایک واضح تصور پروان چڑھ چکا تھا۔ روح ادب کے دیباچے میں جوش لکھتے ہیں:

> ''میں نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات میں نے خلاف واقعہ لکھی کیوں کہ کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ خود سے شعر کہے۔ شعر اصل میں کہا نہیں جاتا وہ تو اپنے کو کہلواتا ہے۔ اس لئے صحیح طرز بیان اختیار کر کے مجھے یہ لکھنا چاہئے تھا کہ نو برس کی عمر سے شعر نے اپنے کو کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ جب میرے دوسرے ہم سن بچے پتنگ اڑاتے اور گولیاں کھیلتے تھے اس وقت کسی علیٰحدہ گوشے میں شعر مجھ سے اپنے کو کہلوایا کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ پتنگ اڑانے اور گولیاں کھیلنے کے فن سے میں

اب تک ناواقف ہوں۔

(دیباچہ۔روح ادب۔ص:9)

شاعری وجدانی کیفیت کا نام ہے۔ بہترین شاعری اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہو۔ مذکورہ بالا عبارت میں جوش کی یہ بات کہ 'شعر نے اپنے کو مجھ سے کہلوانا شروع کر دیا تھا' بہت معنیٰ خیز اور فکر انگیز ہے۔ یہ عبارت شعر کے تئیں ان کی بصیرت اور تنقیدی شعور کا پتہ دیتی ہے۔

واضح رہے کہ روح ادب کے پہلے ایڈیشن میں کچھ خامیاں راہ پا گئی تھیں۔ دوسرے ایڈیشن تک جوش کو اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کا احساس ہو چکا تھا، وہ چاہتے تو دوسرے ایڈیشن میں ان غلطیوں کی اصلاح کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے غلطیوں کو صرف اس احساس کی بنا پر درست نہیں کیا کہ یہ ادبی دیانتداری کے خلاف ہے۔ بہ طور ثبوت یہ عبارت دیکھیے:

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس مجموعے میں کہاں کہاں اغلاط پائے جاتے ہیں اب میرے واسطے نہایت آسان تھا کہ میں اس کتاب کو ان اغلاط سے پاک کر دیتا، مگر چوں کہ یہ امر ادبی دیانت کے خلاف ہوتا، اس لیے میں اس سے باز رہا۔ اس کے علاوہ اگر میں ایسا کرتا تو میرے کلام کی تحقیقات کرنے والا دھوکے میں مبتلا ہو کر میری شاعری کے باب میں صحیح ترین رائے قائم کرنے میں ناکام رہتا۔ نیز اس لحاظ سے بھی مجھے یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا کہ آثار قدیمہ میں ترمیم و تنسیخ کرنا ایک شدید بے رحمی ہے۔''

(دیباچہ، روح ادب، طبع ثانی۔ص:13)

روح ادب کے تیسرے ایڈیشن میں جوش نے کھل کر اپنے تنقیدی افکار و نظریات پیش کیے ہیں۔ اس دیباچے کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اپنی دیگر تخلیقات کی طرح جوش نے تنقید کے شعبے میں بھی اپنی انفرادی فکر اور مخصوص طرز تحریر کو برقرار رکھا ہے۔

جوش اپنی دوسری تحریروں کی طرح تنقید کے میدان میں بھی کسی کی تقلید نہیں کرتے بلکہ اپنے آزادانہ افکار و نظریات کا بے باکی سے اظہار کرتے ہیں۔ اس کے پس پردہ ان کی تلوّن مزاجی اور سیمابی سرشت کو بھی غیر معمولی دخل ہے جو انھیں کسی نظریے کا اسیر نہیں ہونے دیتی۔ روح ادب کے تیسرے ایڈیشن کے دیباچے میں تنقید کے حوالے سے جوش نے اپنے تنقیدی شعور کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''انتقاد و انتخاب تقریباً ناممکن چیز ہے۔ اس راہ میں اتنے پیچ و خم ہیں کہ منزل تو نہیں ملتی، البتہ راہ رَو خود گم ہو جاتا ہے۔ اور اکثر و بیشتر اس گم شدگی کے عالم میں جہاں کہیں ٹھنڈی چھاؤں ملتی ہے اسی کو منزل فرض کر کے وہیں ٹھہر جاتا ہے۔ (دیباچہ، روح ادب)

جوش کی مذکورہ عبارت سے یہ نتیجہ برآمد کیا جا سکتا ہے کہ معمولی عقل و فہم رکھنے والے تنقید نگار کسی بھی صورت سے اعلا درجے کے تنقیدی مضامین نہیں لکھ سکتے ہیں۔ اسی دیباچے میں جوش نے انتقادیات کی تین قسمیں بیان کی ہیں جس سے ان کے تنقیدی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی بتائی ہوئی تین قسمیں یہ ہیں:

(1) تخیلی انتقاد (2) تخریبی انتقاد (3) تحقیقی انتقاد۔

اسی سلسلے میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''ہر چند اس روش میں ایک انوکھا پن، ایک اپج، ایک تراش خراش، ایک آن بان اور نفسیاتی تخیل کی دلچسپی تو ضرور پائی جاتی ہے لیکن اس میں ادیب و شاعر پنہاں، ناقد پیدا، دریا نہاں، سراب عیاں، حقیقت کم اور افسانہ زیادہ پایا جاتا ہے۔''

(دیباچہ، روح ادب، تیسرا ایڈیشن)

جوش نے نثری شہ پاروں میں جس قسم کے آزادانہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی تنقیدی رائے اور واضح تصورات کے غماز ہیں۔

جوش کی وابستگی صحافت سے بھی رہی ہے۔ ماہنامہ کلیم اور ماہنامہ آجکل کے وہ مدیر رہے۔ اس دوران انھوں نے کئی فکر انگیز اداریے لکھے۔ اپنے اداریے میں جوش مختلف شعبہ ہائے زندگی کو موضوع بناتے اور اپنی بے باکانہ رائے کا اظہار کرتے۔ جوش نے صحافت کے متعلق بڑا واضح اور وسیع تصور پیش کیا ہے۔ خاص طور سے انھوں نے کلیم کے اداریے میں نہایت واضح انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ کلیم، اگست 1937 کے اداریے میں جوش نے لکھا ہے:

''آخر ہماری صحافت اس قدر شریر وفتنہ پرور کیوں واقع ہوئی ہے۔ ہماری صحافت کو دنیا بھر کے تمام نام تو دیے جاسکتے ہیں لیکن ان تمام ناموں میں سے جو نام اسے کبھی نہیں دیا جاسکتا وہ بدقسمی سے صحافت اور صرف صحافت ہے۔.....صحافت نام ہے قوموں کو صحیح راستے پر چلانے کا...صحافت کا نام ہے اقوام کے عروج و زوال کے خفیہ اسباب کی پیمائش اور ابنائے زمانہ کے رجحانات کی جانچ پڑتال نیز ضروریات ومقتضیات وقت کا گہرا مطالعہ۔ صحافت کا فرض ہے کہ وہ افراط وتفریط سے دامن کشاں رہتے ہوئے صراط مستقیم پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی قائم رکھے۔ وہ ایک اعلیٰ نباض کی طرح اقوام کے امراض کی تشخیص کرے اور ایک حاذق طبیب کی طرح ایسا نسخہ استعمال کرائے کہ ازالہ مرض ہو جائے۔

(ہماری صحافت، اداریہ، کلیم، اگست 1937، ص:5)

درج بالا اقتباس ''کلیم'' کے اس اداریے سے ماخوذ ہے جسے جوش ملیح آبادی نے کوئی آٹھ دہائیاں پہلے صفحۂ قرطاس پر رقم کیا تھا۔ آج جب ہم اپنے آس پاس ہو رہے حادثات وواقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ صحافت معدودے چند کو چھوڑ کر آج وہی کام کر رہی ہے جس کی طرف جوش نے کھلے لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔ یہ جوش کی دور اندیشی اور اپنے زمانے کے حالات پر گہری نظر کا بین ثبوت ہے کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا اس کو من وعن بیان کیا۔ آج بھی حالات یا تو ویسے ہی ہیں یا پہلے سے بدتر ہی ہوئے ہیں۔ اس اقتباس سے جوش کی ناقدانہ بصیرت کا ہمیں بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''ناقص اور غلط تعلیم، گمراہ کن تربیت اور علم صحافت سے عدم واقفیت ہمارے ایڈیٹروں کو اندھا بنائے ہوئے ہے۔...اس کوچے میں وہی قدم رکھتے ہیں جن کے ناکارہ ہونے کی وجہ سے کوئی پرشش نہیں ہوتی اور مفلس اور

نااہل ہونے کی وجہ سے کوئی دوسرا پیشہ بھی نہیں کر سکتے۔ ... اکثر اخبارات سرمایہ داروں ، خوشامدیوں، جاہ پرستوں اور غداروں کے روپئے یا دوسرے خفیہ سرمایوں سے چلتے ہیں جن کا مقصد اس کے سوااور کچھ نہیں ہوتا کہ ملک میں فساد وفتنہ برپا کر کے حق کو کمزور، باطل کو قوی اور اپنے کو زوردار بناتے رہیں۔''

(ہماری صحافت،اداریہ،کلیم اگست 1937 ص:5)

جوش ملیح آبادی نے درج بالا اقتباسات میں جو کچھ لکھا ہے کیا وہ آج نہیں ہو رہا ہے؟ گویا پچھلے اسّی سال میں جمہوریت کے اس چوتھے ستون میں کسی بھی قسم کی کوئی اصلاح نہیں ہوئی بلکہ جو برائیاں پہلے تھیں وہ آج بھی غالب ہیں۔

شاعروں کے متعلق جوش نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی بالغ نظری اور بھرپور تنقیدی صلاحیتوں کا ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے:

''لیکن اس ہندوستان میں الٹی گنگا بہتی ہے۔ یہاں کا شاعر چڑچڑا، بدخلق، لاف زن، کینہ پرور، بدگمان، غیر مخلص، پست ہمت، سرد مہر اور احسان فراموش ہوتا ہے... ... یہ ذرا سی بات پر بازاری آدمیوں کی طرح روٹھ جاتا ہے، مشاعروں میں اگر ترتیب نشست وغزل خوانی کے سلسلے میں کوئی ادنا سی بات بھی ناگوار گزرتی ہے تو یہ بھری محفل میں چیخنے لگتا ہے، محفل سے باہر نکل جاتا ہے، اور منانے والوں کے حلقے میں ایک مست ہاتھی کی طرح غصے میں پیٹ ہلاتا نظر آتا ہے... ... یہ اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بھی ''انسان'' نظر نہیں آتا۔ اس وقت بھی ''شاعر'' ہی رہنے پر مصر رہتا ہے... ...بات کرتا ہے تو بڑے ٹھسّے سے، داد دیتا ہے تو بڑے غرور کے ساتھ، اٹھتا ہے تو جسم کی ایک خاص مصنوعی صلابت سے، بیٹھتا ہے تو ایک مخصوص دھج سے اور چلتا ہے تو ایسے ٹھاٹھ کے ساتھ گویا خدا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے... ... احسان فراموش اتنے پرلے درجے کا ہوتا ہے کہ آپ تمام عمر اس پر احسان کرتے رہیں، لیکن ایک دن بھی آپ نے اس کے لہک لہک کر غزل پڑھنے پر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے ''واہ واہ'' کے نعرے نہ مارے، تو بس اسی وقت آپ کے تمام احسانات ختم ہو جاتے ہیں اور وہ آپ سے نفرت کرنے لگتا ہے۔''

(اشارات۔جوش ملیح آبادی،ص۔18-17)

جوش ملیح آبادی خود اچھے شاعر تھے۔ وہ شاعروں کی پوری جماعت ، مشاعروں کی روایت اور جملہ آداب سے بھرپور واقفیت بھی رکھتے تھے مگر اس کے بعد بھی انھوں نے جس صاف گوئی سے درج بالا اقتباس میں اپنی رائے ظاہر کی ہے اس سے نہ صرف ان کی بے باکی بلکہ تنقیدی شعور کا بھی پتا چلتا ہے۔ اسی حوالے سے جوش نے شاعر اور شاعری کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی سنتے چلیں۔ ذیل کے اقتباسات جوش کی منفرد سوچ اور فکر کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور اُن کی تنقیدی فکر کی غمازی بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان اقتباسات میں جوش نے جس بے باکانہ انداز میں اپنی بات پیش کی ہے وہ انھی کا خاصہ ہے:

''قطب شاہوں کے دور سے لے کر اس عہد تک کے شعرا کا کلام پڑھیے کیا وہی ایک حسن و عشق کا موضوع ہر جگہ نہیں پایا جاتا؟ شاعر اور صرف ایک موضوع اتنی حیرت ناک بات ہے۔ یہ سچ ہے کہ شاعری میں سب سے زیادہ دلکش موضوع حسن و عشق ہی ہے۔ لیکن شاعر کے لیے کیا یہ ممکن ہے کہ زندگی بھر ایک ہی موضوع سے وابستہ رہے۔ اسے اس پورے کرۂ ارض کی کوئی دوسری شے تمام عمر متاثر ہی نہ کر سکے۔ کیا ہمارے ''شعرائے کرام کی زندگیوں میں کبھی مست گھٹائیں جھوم کر نہ آئی تھیں۔ کبھی پپیہا نہیں کوکتا تھا، کبھی چاندنی کھیت نہیں کرتی تھی۔ کبھی برستی اور جھومتی ہوئی راتیں بال نہیں بکھراتی تھیں۔ کبھی پیچ و خم کھاتے ہوئے دریا ان کے سامنے نہیں لہراتے تھے اور کبھی افق کا دریچہ کھول کر دوشیزہ سحران کے روبہ رو نہیں مسکراتی تھی؟

اس کے علاوہ ان کی معاشرت و سیاست میں کبھی کوئی قابل ذکر انقلاب نہیں ہوا تھا۔ کبھی ان کی قوم پر کوئی دل دہلانے والی مصیبت نہیں آئی تھی۔ کبھی ان کا کوئی دوست نہیں بچھڑ گیا تھا۔ کبھی کسی نے ان پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ کبھی انھوں نے کسی یتیم کا اترا ہوا منھ اور کسی نوجوان بیوہ کی الجھی ہوئی کا کلیں نہیں دیکھی تھیں؟ اور کیا کبھی انھوں نے کسی ظالم و غاصب کو خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے نہیں دیکھا تھا؟

اور اگر انھوں نے یہ تمام مناظر و واقعات دیکھے تھے اور ضرور دیکھے تھے تو مروت و رعایت اور بزرگ پرستی کو بالائے طاق رکھ کر جواب دیجیے کہ کیا اس گروہ کو حسّاس ترین گروہ کہہ سکتے ہیں اور کیا یہ شعرا سریع الاشتعال جذبات کے حامل کہے جا سکتے ہیں؟

(اشارات۔ جوش ملیح آبادی، ص۔ 67)

اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے جوش صاحب ذرا آگے تحریر فرماتے ہیں:

''اردو شاعری کے آغاز سے اس وقت تک ہندستانی زندگی میں کتنے سیاسی و معاشرتی انقلاب ہو چکے ہیں، لیکن ان کے دواوین میں ان کا پتہ تک نہیں چلتا۔''

(اشارات۔ جوش ملیح آبادی، ص۔ 68)

اسی ضمن میں جوش ہم سب کے سامنے سوال بھی رکھتے ہیں اور غزل کی مخالفت میں اپنا بھر پور اور واضح نظریہ بھی پیش کرتے ہیں۔ غزل کی مخالفت میں حالی، عظمت اللہ خاں، کلیم الدین احمد وغیرہ نے مدلل انداز میں اپنا زاویۂ نظر پیش کیا تھا اور جوش نے بھی اپنی رائے بڑے مدلل انداز میں پیش کی ہے مگر ذیل کے اقتباس کو پڑھنے کے بعد ہمیں اس امر کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جوش کی نظر محض شاعری کی روایت، تہذیب اور کلچر پر ہی نہیں تھی بلکہ وہ بہت بالغ نظری کے ساتھ سیاست کو بھی سمجھ رہے تھے:

''آہ کس سے یہ حقیقت بیان کی جائے اور اس دور خام و خام نوازی میں کون اس پر یقین لا سکے گا کہ ہر شاعر، موزوں طبع ہوتا ہے لیکن ہر

موزوں طبع، شاعر نہیں ہوتا۔ کیا میری قوم ایک
لمحے کے لیے غور کرے گی کہ غزل کو باقی رکھنے
میں کتنا ادبی نقصان، کس قدر سیاسی خطرہ ہے؟
(اشارات۔ جوش ملیح آبادی، ص۔69)

جوش کے یہاں گھن گرج صرف ان کی شاعری میں ہی نہیں ہے بلکہ اپنے افکار ونظریات کو پیش کرنے میں بھی انھوں نے دوٹوک انداز اور واضح رویہ اپنایا ہے۔ اوپر پیش کیے گئے اقتباسات سے اس بات کی بھرپور تائید ہوتی ہے کہ تنقید لکھتے وقت یا تنقیدی خیالات کو ظاہر کرتے وقت انھوں نے بے لاگ لپیٹ انداز میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اس ضمن میں نیم ناقدین اور خام مقالہ نگاروں کے متعلق جوش کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''ہماری یہ صدی، 'ہمہ دانی' کی
صدی ہے۔ کیوں کہ ہم اتنے متعدد مسائل اور
اس قدر مختلف علوم میں اپنی دستگاہ کا مظاہرہ
کرتے ہیں کہ آخر کار ارباب نظر کو پتا چل
جاتا ہے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں اور ہماری نظر
کس قدر وسیع واقع ہوئی ہے... ... ہم میں
سے اکثر 'ارباب علم' کا ماخذ ہوتی ہیں، گھبرائے
ہوئے ایڈیٹروں کی رائیں او ربھٹکے ہوئے
مقالہ نگاروں کی تنقیدیں، یا زیادہ سے زیادہ
انسائیکلو پیڈیا کی جلدیں، ہم ان تمام رایوں او
رتنقیدوں کو جو ہمیں مہنگے یا سستے رسالوں اور
اخباروں سے گڑھی گڑھائی اور ڈھلی ڈھلائی
مل جاتی ہیں، چپ چاپ تسلیم کر لیتے ہیں۔ او
رجب کبھی علمی صحبت میں علم فروشی کا موقع ہاتھ
آجاتا ہے تو ہم ان تمام بنی بنائی مستعار رایوں
او رتنقیدوں کو اپنے ذاتی 'علمی تصورات' اور
'حکیمانہ نظریات' کی شکل میں میزوں پر
گھونسے مار مار کر اس ولولے اور طُمطُراق کے
ساتھ پیش کرنے لگتے ہیں گویا مادر فضیلت کا
خلف اکبر اپنی تخت نشینی کا اعلان کر رہا ہے۔''
(اشارات۔ جوش ملیح آبادی، ص۔32-31)

'یادوں کی برات' جوش کی شہکار تصنیف ہے۔ اس خودنوشت سوانح کو شہرت عام اور بقائے دوام عطا کرنے میں جوش کے اسلوب کی ندرت اور دلکشی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس فن پارے کو جوش نے صنائع اور بدائع کے موزوں استعمال سے خوب سنوارا ہے۔ چوں کہ ان کے پاس الفاظ کا گنجِ گراں مایہ ہے جس کا تصرف وہ فن کارانہ مہارت سے کرتے ہیں۔ یادوں کی برات میں انھوں نے جس صناعی اور خوبصورتی سے اپنے آپ کو پیش کیا ہے وہ بے مثال ہے۔

جوش نے یادوں کی برات کو چند ابواب میں تقسیم کیا ہے جن میں دو باب اہم ہیں۔ 'میرے چند قابل ذکر احباب' اور 'میرے دور کی چند عجیب ہستیاں'۔ اول الذکر میں چند شخصیات قابل ذکر ہیں، جن کا بھرپور احاطہ جوش نے کیا ہے۔ فانی بدایونی، کنور مہندر سنگھ بیدی، سردار دیوان سنگھ مفتون، مولانا عبدالسلام، فراق گورکھپوری، وحیدالدین سلیم اور مجاز ایسے نام ہیں جو جوش کے دوست بھی ہیں اور ہم عصر بھی۔

فانی کے متعلق جوش کی رائے ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ جوش نے کس خوبصورتی سے اپنی بے حد متوازن تنقیدی رائے پیش کی ہے جس میں کسی بھی قسم کی کوئی عصبیت یا معاصرانہ چشمک تک نہیں ہے، اس میں فانی کی شخصیت یا شاعری کو کم تر ثابت کرنے کی کسی بھی قسم کی کوئی شعوری کوشش نہیں ہے جو اس

بات کا کھلا اظہار ہے کہ جوش تنقید کرتے وقت بھی عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں جانے دیتے:

''میرے تمام معاصرین میں وہ سب سے بمراحل بلند مرتبہ غزل گو شاعر تھے۔ میں ان کی غم پرستی کا قائل نہ سہی لیکن یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ ان کی غزل کا قافیہ پیمائی سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ان کی ہر غزل ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص طرز فکر کی حامل ہوتی تھی، جن کی آج تک کوئی نقل بھی نہیں کر سکا۔(یادوں کی برات،ص:488)

اسی طرح انھوں نے کنور مہندر سنگھ بیدی کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اس سے بھی ان کی بھرپور تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ آپ بھی وہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''صرف یہی نہیں کہ وہ ایک بہت اچھے غزل گو شاعر ہیں بلکہ ان کی پوری زندگی غزل ہے اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح غزل مختلف ومتضاد اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے اسی طرح کنور صاحب کی ذات بھی مختلف ومتضاد اشغال کا مجموعہ ہے۔''

(یادوں کی برات،ص:511)

اسی حوالے سے مولانا عبدالسلام کے متعلق بھی جوش کی رائے دیکھتے چلیں جس میں تاثر اور تنقید کے ملے جلے اثرات موجود ہیں اور یہاں بھی جوش نے ہمدردانہ سلوک جاری رکھتے ہوئے اپنی رائے بالکل بے لاگ لپیٹ پیش کی ہے:

''وہ مشرقی علوم کے حرف آخر انسان اور شاہنشاہ تھے۔ قرآن، حدیث، منطق، حکمت، تصوف، عروض، معنی وبیان، علم الکلام، تاریخ، تفسیر، لغت، لسانی قواعد، ادب اور شاعری کے امام تھے... دہلی کی ٹکسالی اردو بولنے والوں میں اب صرف وہی رہ گئے تھے۔ وہ جب باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے اور جی چاہتا تھا کہ وہ پہروں یوں ہی بولتے رہیں۔ اور جب اپنی باتوں میں وہ فحش کی آمیزش کر دیتے تو خدا کی قسم مزا آجاتا۔''

(یادوں کی برات،ص:538-537)

فراق گورکھپوری کے متعلق بھی جوش کی رائے ملاحظہ فرمائیں، یہاں بھی جوش کا تنقیدی ذہن اور شعور کارفرما ہے:

اپنے فراق کو میں قرنوں سے جانتا اور ان کی خلاقی کا لوہا مانتا ہوں۔ مسائل علم وادب پر جب وہ زبان کھولتے ہیں تو لفظ ومعنیٰ کے لاکھوں موتی رولتے ہیں۔ اور اس افراط سے کہ سامعین کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگتا ہے۔''(یادوں کی برات،ص:546)

اسی ضمن میں مجاز کے متعلق جوش کے خیالات بھی پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ:

''یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ مجاز کیا تھا اور کیا ہو سکتا تھا۔ مرتے وقت تک اس کا فقط ایک ربع دماغ کھلنے پایا تھا اور اس کا یہ سارا کلام اس کی ایک ربع کھلاوٹ کا کرشمہ ہے، اگر وہ بڑھاپے کی عمر تک آتا تو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر ہوتا۔''(یادوں کی برات، ص:559)

علی گڑھ کے ایک گمنام پٹھان شاعر کے متعلق جوش کی رائے سے نہ صرف شاعر بلکہ شاعری کی تہذیب پر بھی روشنی پڑتی ہے:

''یہاں تک تو کوئی عجیب بات نہیں تھی ، ہزاروں شاعروں کو ہوکا ہوتا ہے اپنا کلام سنانے کا، مگر ان میں یہ عجیب بات نہیں تھی کہ جب وہ کسی شاعر کو پھانس کر اپنے کمرے میں لے آتے تھے تو ان کا سدھا ہوا ملازم تینوں دروازوں میں باہر سے زنجیر لگایا کرتا تھا کہ پھنسا ہوا شاعر بھاگ نہ سکے۔ جب باہر سے دروازے بند ہوجاتے تھے تو وہ الماری کھول کر اپنا دیوان نکال لاتے اور غزلیں سنانا شروع کردیا کرتے تھے اور سننے والا جب ان کو داد دیتا تھا تو ہر داد پر بڑے تحکمانہ انداز سے وہ حکم دیتے تھے۔ کھڑے ہوجایئے، اور جب وہ حیرت زدہ ہوکر کھڑا ہوجاتا تھا تو اس کو اس طرح بھینچ کر گلے لگاتے تھے کہ ان کی پسلیاں بولنے لگتی تھیں۔''

(یادوں کی برات، ص:569)

جوش ملیح آبادی نے اپنی نثری تحریروں میں ادب، سماج، معاشرت، کلچر، تہذیب و تمدن، سیاست، قومیت، رسم و رواج، تہوار وغیرہ گوناگوں پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ایسی تحریر کو قلمبند کرتے ہوئے جوش نے موضوع کے تمام تر نکات کو بھرپور طرح سے احاطۂ تحریر میں لایا ہے۔ جوش کی شاعری میں جو انداز تخاطب ہے اس کے برعکس مندرجہ بالا مضامین پر لکھتے ہوئے انھوں نے بہت غور و فکر اور سنجیدگی کے ساتھ موضوع کے سیاق اور پس منظر کو بھی اپنی فکر کا حصہ بنانے کی کامیاب سعی کی ہے اور جو نتائج پیش کیے ہیں ان میں واضح انداز میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ انھوں نے سماج و معاشرے کے ایسے پہلوؤں کو زیر بحث لایا ہے جن پر لکھتے یا سوچتے ہوئے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ ان کی رائے آج کے زمانے میں یقیناً انقلابی تصور کی جائے گی تو اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اب سے کوئی سات آٹھ دہائی قبل جوش نے کس حق گوئی و بے باکی سے ان مسائل پر اپنا قلم اٹھایا ہوگا۔ اس حوالے سے جوش کی یہ رائے دیکھتے چلیں جس میں انھوں نے ہندستانی عوام کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم کرنے کے لیے تمام تر تاریخی اور سماجی پس منظر پر غور و فکر کرنے کے بعد اپنی رائے بے باکی کے ساتھ اس طرح پیش کی ہے:

''میں تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحوں میں اتحاد دیکھنا چاہتا ہوں اور میرے عقیدے میں ہندستان کی کامل نجات ناممکن ہے، جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی ازدواج قائم ہوکر ان دونوں گروہوں کی تہذیب و معاشرت ایک نہ ہوجائے۔''

(اشارات۔ جوش ملیح آبادی، ص۔32-31)

میں اس مضمون کو جوش کی زندگی کے اس واقعے پر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ جب وہ حیدرآباد تشریف لائے تھے اور حضور نظام تک رسائی کے لیے ان کو وسیلے کی ضرورت تھی۔ حضور نظام کے وزیر مالیات اکبر حیدری نے ان کی سفارش تو کی مگر جوش کو ان کا لہجہ پسند نہ آیا اور دیکھیے جوش نے ان کے لہجے پر کس طرح اپنی تنقیدی رائے ظاہر کی ہے:

ہر چند حیدری صاحب کے اس وعدے سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی تھی، مگر وہ جو کہاوت ہے

کہ بکری نے دودھ دیا، سو وہ بھی مینگنی بھرا، مجھے
ان کے لہجے سے بڑی تکلیف ہوئی تھی کہ وہ
''میں'' کے لفظ کو ''بکسرۂ میم'' ادا کر کے
بکریوں کی طرح ''میں میں'' کر رہے تھے ...
... خوب جانتا ہوں کہ لہجے اچھے ہوتے ہیں نہ
برے، ان کا اچھا یا برا لگنا مبنی ہوتا ہے کانوں کی
موروثی عادت پر، اور ہم جس لفظ کا تلفظ بچپن
سے جس طور پر سنتے آئے ہیں، جب وہی لفظ
بدلے ہوئے لہجے میں سنتے ہیں تو ہم کو تکلیف
ہوتی ہے۔

(یادوں کی برات، ص:210-209)

اسی واقعے کے حوالے سے اور ایک بات جس میں جوش کے منفرد لب و لہجے اور تنقیدی شعور کا دوٹوک انداز موجود ہے، اس کو پیش کر کے راقم الحروف اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہے کہ جب اکبر حیدری نے ''سر'' کا خطاب ملنے پر اپنے اوپر لکھی گئی کئی تہنیتی نظمیں جوش کو سنائیں تو جوش نے کوئی داد نہ دی، اس پر سر اکبر حیدری نے پوچھا کہ کیا آپ کو نظمیں پسند نہ آئیں جو آپ نے داد نہ دی تو جوش نے کہا کہ میں تو یہی مانتا ہوں کہ جس کو انگریزی حکومت کے خطابات مل جاتے ہیں مانو اس پر ماں کی گالی پڑ جاتی ہے۔

جوش نظام حیدرآباد تک رسائی حاصل کرنا چاہتے تھے اور اس کام کے لیے ذریعہ سر اکبر حیدری تھے مگر جب حق گوئی اور بے باکی کا مرحلہ سامنے آیا تو جوش نے نہ تخت دیکھا نہ تختہ اور کسی انجام کی پرواہ کیے بغیر اپنی رائے ظاہر کر دی۔ ایسی تنقید کے نمونے ہمیں اپنے ادب میں اب بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔

☆☆☆


ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین
کا مجموعہ

# افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:
زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶
ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

بیگ احساس

رپورتاژ

# ایوارڈ یاترا

21/دسمبر 2017ء کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کا اعلان پریس کانفرنس میں کیا جا رہا تھا۔ پریس کانفرنس کے ختم ہوتے ہی موبائیل بج اٹھا۔ ادھر سلمان عبدالصمد تھے ''سر مبارک ہو۔ دخمہ پر ایوارڈ کا اعلان ہوا ہے''۔ ابھی میں پوری طرح سنبھلا بھی نہیں کہ جناب کے سری نواس راؤ، سکریٹری، ساہتیہ اکادمی کا فون آیا انھوں نے مبارک باد دی، اس کے ساتھ ہی جناب چندر بھان خیال، کنوینر اردو، ساہتیہ اکادمی کا فون آیا۔ پھر تو یہ خبر پتہ نہیں کیسے جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ملک بھر سے فون آتے رہے۔ اس روز رات تک صرف فون کے جواب میں ''شکریہ'' ادا کرتا رہا۔ لمحے بھر کے لیے بھی فون خاموش نہیں رہا۔ پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ریاض میں مقیم بیٹی نے کہا وہ ایوارڈ فنکشن میں شرکت کے لئے بطور خاص دلّی آئے گی۔ ادھر حیدرآباد میں جو بیٹی ہے اس نے بھی کہا کہ وہ ساتھ چلے گی۔ امریکہ والی بیٹی اپنی مجبوری جانتی ہے بیٹوں کو ملازمتوں نے جکڑ کر رکھا ہے۔ شام چھ بجے انیس الرحمٰن نے ای ٹی وی اردو سے فون کیا کہ وہ آرہے ہیں اور میرے تاثرات ریکارڈ کرنا چاہتے ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا کے جیہ کرشنا نے فون کیا۔ انھوں نے فون پر کچھ سوالات کیے۔ تصویریں میل کرنے کو کہا۔ دوسرے دن اخبارات میں خبر چھپی تو شہر میں موجود دوستوں اور رشتہ داروں کے فون آنے لگے۔ دوسرے روز میر ایوب علی خاں صاحب نے بتایا کہ تیلگو میں دیوی پریا کو بھی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا ہے۔ تعمیر ملت دونوں کا تہنیتی جلسہ کرے گی۔ پھر تہنیتی جلسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 23/دسمبر کو شاہین ویمنس ری سورس اینڈ ویلفیر ایسوسی ایشن کی جمیلہ نشاط نے ایک جلسہ رکھا۔ ممبئی سے رحمٰن عباس آئے تھے۔ شموئیل احمد ان دنوں حیدرآباد میں ہیں۔ ان کے بیٹے کی پوسٹنگ یہاں ہوئی ہے۔ رحمٰن عباس اور شموئیل احمد کے ساتھ مجھے بھی بلا لیا گیا۔ وہاں انگلش شاعرہ نینہ داس بھی موجود تھیں۔ اردو زبان کی صورت حال پر مختصر سا مذاکرہ ہوا اور اس کے ساتھ ہمیں ایوارڈ ملنے پر تہنیت بھی پیش کی گئی۔ رحمٰن عباس نے مہاراشٹرا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ حاصل کر کے کچھ ایسی غلط فہمی پھیلائی ہے کہ اکثر لوگ انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ سمجھتے اور لکھتے ہیں۔ جرنلسٹوں کے قتل کے خلاف احتجاج کے سلسلے میں جو ایوارڈ واپس کیے گئے اس وقت بھی رحمٰن عباس کے متعلق یہی غلط فہمی برقرار رہی اور حیدرآباد میں بھی یہی ہوا۔ اس میں رحمٰن عباس کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا نیم خواندہ صحافیوں کا ہے۔ 7/جنوری کو ٹائمز آف انڈیا کے سنڈے ایڈیشن میں دو صفحوں پر نمایاں تصویروں کے ساتھ انٹرویو شائع ہوا۔

14/جنوری کو ''تعمیر ملت'' حیدرآباد کے زیر اہتمام میری اور دیوی پریہ کی تہنیتی تقریب سالار جنگ ہال میں منعقد کی گئی۔ یہ پہلی باضابطہ تہنیتی تقریب تھی۔ جو اہتمام سے منائی گئی۔ جناب سید جلیل احمد، صدر تعمیر ملت نے صدارت کی۔

15/جنوری کو محترمہ رانی اندرا دیوی دھن راج گیر جی نے گھر بلایا۔ ایوارڈ کی اطلاع سن کر انھوں نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا تھا۔ ایک چھوٹی سی محفل میں جس میں پروفیسر اشرف رفیع، جناب شاہد حسین زبیری، نواب اصغر حسین، تلگو رسالے ''نیلا ونکا نیما لیکا'' کی ایڈیٹر شریمتی لکّا راجو دیوی ان کے ساتھی شری راملو اور ہندی کے شاعر اوپیندر کمار کی موجودگی میں رانی صاحبہ نے گل پوشی کی۔

18/جنوری کو شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد میں

صدر شعبہ اردو، پروفیسر حبیب نثار نے تہنیتی تقریب منعقد کی۔ پروفیسر پنچانن موہنتی، ڈین، اسکول اف ہیومانٹیز، محترمہ انداردیوی دھن راج گیر جی، پدم شری مجتبیٰ حسین، پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر ایس۔اے۔شکور، ڈائریکٹر / سکریٹری، تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکادمی، جناب نورالحسنین اورنگ آباد سے اور جناب خورشید حیات بلاس پور سے بطور خاص اس تقریب میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔

18/جنوری کو تہنیتی تقریب کے شاندار انعقاد کے بعد گھر واپس ہوا تو بڑی تھکن سی محسوس ہوئی۔ ایک طویل عرصہ بعد پیر کے جوڑوں میں درد ہونے لگا۔ سخت نقاہت اور کمزوری محسوس ہونے لگی۔ 12/فروری کو دلّی جانا تھا۔ اس سے قبل خود کو تندرست رکھنا بے حد ضروری تھا۔ لیکن دن بہ دن کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ آواز میں نقاہت آ گئی تھی۔ چند قدم چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ گھر کے تمام افراد خصوصاً بڑی بیٹی جو سعودی عرب میں ہے اور دوسری بیٹیاں تشویش میں مبتلا رہیں۔ مختلف ٹسٹ، ٹسٹ کی رپورٹس۔ ادھر دعا بھی کی جا رہی تھی۔ بظاہر کوئی بیماری نہیں تھی مگر کمزوری نے اعتماد متزلزل کر دیا تھا۔ ادھر دن قریب آ رہے تھے۔ اس حالت میں کیسے ایوارڈ حاصل کروں گا؟ پریس سے ملاقات میں کیسے کچھ کہہ سکوں گا۔ پھر رائٹرز میٹ میں ایوارڈ کے حصول کے بعد اپنے تاثرات بھی پیش کرنے تھے۔ آواز برسوں کے بیمار کی سی ہو گئی تھی اور قدم اٹھانا محال تھا۔ آہستہ آہستہ ایوارڈ کی تقریب کے دن قریب آ رہے تھے۔ طبیعت کسی حد تک سنبھلی تو سوچ لیا کہ اب جیسے بھی ہو جانا تو ہوگا ہی۔

19/جنوری کے ''ہندو'' میں شافع قدوائی کا ''دخمہ'' پر تبصرہ شائع ہوا۔ ایک ہفتہ بعد یہی تبصرہ حیدرآباد ایڈیشن میں شائع ہوا۔

31/جنوری کے ''تہلکہ'' (ہندی) میں عبدالواسع نے جو انٹرویو کیا تھا شائع ہوا۔

اسی کشمکش میں 11/فروری کا دن آ گیا۔ 8.40 کی فلائٹ تھی۔ 6 بجے ایرپورٹ پہنچے۔ ایرپورٹ وقت سے پہلے پہنچنے کی عادت ہے۔ ایڑھی میں ہلکا ہلکا درد برقرار تھا۔ عجیب بے یقینی کی کیفیت تھی۔ 8.10 کو بورڈنگ ہوئی۔ سپائس جیٹ کی فلائیٹ تھی۔ اس فلائٹ میں ٹکٹ خریدنے کے بعد ایک میسج آتا ہے کہ صرف تھوڑی سی رقم خرچ کر کے آپ اپنی پسند کی آرام دہ سیٹ حاصل کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی گرما گرم کھانا بھی پیش کیا جائے گا۔ فون بھی آتا ہے کہ کیا آپ ایسا کرنا پسند کریں گے۔ آپ کا سامان فوراً چیک ان کیا جائے گا اور واپسی میں بھی آپ کا سامان سب سے پہلے دیا جائے گا۔ سیٹ پر بیٹھے تو اندازہ ہوا کہ یہ لالچ کیوں دیا جاتا ہے۔ سیٹوں کے درمیان اتنی کم جگہ کہ جیسے آدمی کو اس میں فکس کر دیا گیا ہو۔ سیٹ میں پھنس کر سفر کرتے رہے۔ دو گھنٹے گزر گئے پلین لینڈ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ باہر بھی سوائے بادلوں کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دل دھڑکنے لگا۔ ابھی چند دنوں قبل مجتبیٰ حسین صاحب صدف انٹرنیشنل والوں کا ایوارڈ لینے پٹنہ گئے تھے۔ کہر کی وجہ سے جہاز پٹنہ پر لینڈ ہی نہ ہو سکا۔ آخر وہ کلکتہ کے ایرپورٹ پر آ کر ٹھہر گیا۔ وہیں سے فون پر مجتبیٰ صاحب نے مخاطب کیا اور حیدرآباد لوٹ آئے۔ پلین آہستہ آہستہ فضا میں گھومتا رہا۔ چالیس منٹ بعد وہ دلی ایرپورٹ پر اترا تو جان میں جان آئی۔ دلّی کا موسم خوشگوار تھا۔ ہوٹل پہنچے ساہتیہ اکادمی کا آدمی منتظر تھا۔ دوسرے دن صبح سوا نو بجے تیار رہنا تھا۔ کمرے پر ہی کھانا منگوایا۔ کسی سے ملنے کو جی نہیں چاہا۔ صبح ناشتہ کا انتظام نیچے سیلر میں تھا۔ وہاں تمام ایوارڈ حاصل کرنے والوں سے ہائے اور ہیلو ہوئی۔ سوا نو بجے تیار ہو کر نیچے آئے تو تمام ادیب و شاعر تیار تھے۔ ہمارے گلوں میں آئڈنٹیٹی کارڈ ڈال دیئے گئے۔ ساہتیہ اکادمی فیروز روڈ پر ہے۔ اور ہوٹل بابر روڈ پر تھا۔ بس چند منٹوں کا فاصلہ تھا۔ اکادمی کے احاطے میں پہنچے رویندر بھون

لان عارضی خیمے لگا کر بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ مجھے پچھلے برس بھی ''پروٹاری'' پروگرام میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ اس سال سجاوٹ مختلف تھی۔ سامنے بڑے سے بورڈ پر 2017-1947 ساہتیہ اکادمی کے ستر سال جلی حرفوں میں لکھا تھا۔ ان حرفوں کو ادیبوں کی تصویروں سے بنایا گیا تھا۔ اردو کے بھی کئی چہرے تھے۔ داخلے پر ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے۔ سرینواس راؤ کھڑے تھے۔ ساتھ ہی مسز رینو موہن بھان کھڑی تھیں۔ دونوں نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔'' آیئے بیگ صاحب!! مبارک ہو'' اچھا لگا۔ سارے ادیب آ گئے تھے۔ سامنے کے حصے میں چائے کا انتظام تھا اندر کی طرف ایک اور داخلہ تھا جہاں سرخ ربن لگا ہوا تھا۔ سب وہاں جمع ہو گئے۔ ہندی کی مشہور فکشن نگار شریمتی چترا مدگل فیسٹیول کا افتتاح کرنے کے لیے کھڑی تھیں۔ وہ واحد خاتون ہیں جنھوں نے ویاس سمّان، ساہتیہ کرتی ایوارڈ، اندرشرما کتھا سمّان، شکھر سمان، ساہتیہ بھوشن سمّان چکر دھر سمان، پریکشا ایوارڈ اور نہ جانے کتنے ایوارڈ حاصل کیے تھے۔ سادہ سی تقریب۔ دلی جو دارالخلافہ ہے۔ لیکن کوئی بھی سیاست داں، کوئی منسٹر، کوئی ایمبیسڈر مدعو کیا جا سکتا تھا لیکن ایک بڑی ادیبہ کے ہاتھوں میلے کا افتتاح ہو رہا تھا۔ یہی ہونا بھی چاہیے فن کار سے بڑا کوئی نہیں ہوتا مجھے ساہتیہ اکادمی کی یہی بات سب سے زیادہ پسند ہے۔ ٹھیک دس بجے افتتاح ہوا۔ شریمتی چترا مدگل نے مختصر سی تقریر کی۔ جناب سری نواس راؤ، سکریٹری، ساہتیہ اکادمی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ افتتاح ہو گیا صرف دس منٹ لگے۔ بے ساختہ ہونٹوں پر مصرع آ گیا

ع اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

ایک نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ساہتیہ اکادمی کے کارناموں کی جھلکیاں پیش کی گئی تھیں۔ تمام زبانوں کی کتابیں تھیں۔ اخباروں کے تراشے، تصویریں، سمیناروں، لکچروں اور ورک شاپس جو مختلف زبانوں میں ہوئے ان کی جھلکیاں تھیں۔ اخباروں کے تراشے انلارج کر کے لگائے گئے تھے۔ اردو اخبارات بھی نظر آئے۔ ایک اخبار کے تراشے پر 2017ء کا اردو ایوارڈ ملنے کی خبر اور اپنی تصویر دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ میدان میں جگہ جگہ 12 فٹ کے پیانل لگے تھے۔ ایک پیانل پر چار ایوارڈ یافتہ ادیبوں کی تصویریں اور ان کا تعارف تھا۔ ایک فخر سا محسوس ہوا اپنی نمائش سے خوش ہونا آدمی کی فطرت ہے۔ مختلف اسٹانڈز میں ایوارڈ یافتہ کتابیں رکھی تھیں۔ ایک عارضی بنائے ہوئے اڈیٹوریم میں اسٹیج لگا تھا۔ ایک قطار میں ہال کی ساری کرسیاں بھر گئی تھیں۔ چوبیس زبانوں کے فنکاروں کو بٹھا دیا گیا۔ ایک موڈریٹر اور سامنے کرسیوں پر آڈینس اور پریس کے لوگ۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے میڈیا سے گفتگو پروگرام شروع ہوا۔ سوالات پوچھے جانے لگے۔ میرے حصے میں جو سوال آیا وہ یہ تھا کہ کتابیں اور رسائل اب پہلے کے مقابلے میں کم کیوں شائع ہو رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ'' انٹرنیٹ اور سمارٹ فون نے کتابیں پڑھنے والوں پر اثر ضرور ڈالا ہے۔ لیکن سنجیدہ رسالے اور ادب پہلے بھی کم تعداد میں پڑھے جاتے اور شائع ہوتے تھے آج بھی یہی حال ہے البتہ مقبول رسائل شائع ہونا بند ہو گئے۔ اب لوگ انٹرنیٹ پر شاعری اور فکشن پڑھتے ہیں۔ لائبریریاں ڈیجیٹلائیز ہو گئی ہیں۔ پڑھنے والے کم نہیں ہوئے۔ طریقہ کار بدل گیا ہے۔ میں نے کہا کہ لفظ کسی نہ کسی صورت میں تا قیامت زندہ رہے گا۔ لفظ مر نہیں سکتا۔'' کچھ اسکالرز اور بھی سوالات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن پورے چوبیس ادیبوں کو موقع دینا تھا۔ تمام ادیب تو پھر بھی بول نہ سکے۔ ایک عرصہ بعد پروفیسر ادئے نارائن سنگھ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے چودہ برس یونیورسٹی آف حیدرآباد میں پڑھایا ہے۔ انھیں میتھلی زبان میں انعام ملا تھا۔ کے پی رامانونی (ملیالم)، نے بھی سیکولرزم اور ملی جلی تہذیب کو قایم رکھنے پر زور دیا۔ ان کا ناول'' دیوا تنٹے پستکم'' کا موضوع بھی سائنس، فلاسفی اور مذہب ہے۔ لنچ تک یہ سلسلہ

چلا۔طبیعت پوری طرح ٹھیک ہوگئی تھی۔آواز بھی لوٹ آئی نقاہت اور کمزوری کا اب شائبہ بھی نہ تھا۔جوڑوں کا درد بھی دور ہو گیا تھا۔ لنچ کے بعد ہم ہوٹل لوٹ آئے۔میں نے دیکھا بنگالی کے افسر احمد جن کی سنہ پیدائش 1957ء ہے چلنے میں بڑی تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔مجھے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔لیکن افسوس ضرور ہوا وہ پوری طرح پیر اٹھا کر چل نہیں پا رہے تھے۔ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں سب سے کم عمر ریتا بارو، بوڈو کی ناول نگار تھیں ان کا سنہ پیدائش 1975ء ہے۔مجھ سے بڑے شیو مہتا (ڈوگری) 1946ء، ارمی گھنیشیام دیسائی (گجراتی) 1938، رمیش کنٹل میگھ (ہندی)،1931ء میگھ جی چھڑی کے سہارے بڑی مشکل سے چل رہے تھے لیکن انھوں نے کسی کا سہارا لینا گوارہ نہیں کیا۔اوتار کرشن رہبر (کشمیر) 1933ء، جگدیش لچھانی (سندھی) 1939، تھے۔ باقی سب بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں پیدا ہونے والے فن کار تھے لیکن عمر سے زیادہ معمر نظر آرہے تھے۔لنچ ہوا۔اوتار کرشن رہبر بڑی محبت سے ملے۔اور ماضی کی باتیں دلچسپ انداز میں کرتے رہے اسی دوران ادھر الیکشن ہو رہے تھے۔پتہ چلا چندر شیکھر کمبار پریزیڈنٹ اور ماھوکوشک وائس پریزیڈنٹ منتخب ہو گئے۔اردو کے کنوینر کے لیے بھی ش۔ک۔نظام اور اجئے مالویہ کے درمیان مقابلہ ہوا اور اجئے مالویہ تین ووٹ سے ہار گئے۔ایسا پہلی بار ہوا کہ کسی نے کنوینر کے لیے مقابلہ کیا ہو۔لنچ کے بعد ہوٹل پہنچا دیئے گئے۔4 بجے ہائی ٹی تھی اور وہیں سے کمانی اڈیٹوریم جانا تھا۔دوبارہ رویندر بھون آئے تو کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ریفریشمنٹ کے لیے ایک لمبی قطار لگی تھی۔ایسے میں موسیٰ رضا کام آئے۔بہت سے صحافی بھی تھے آج اردو والے بھی نظر آئے۔پروفیسر شہزاد انجم، فیروز عالم اور کئی اسکارز تھے۔شہلا نواب بھی تپاک سے ملیں۔کچھ اسکالرز ساتھ تصویر کھنچوانے لگے۔کہاں کا ریفریشمنٹ اور کیسی چائے!!ایک دوسرے سے مل کر ہم سب ان چیزوں سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ ہندی کے پروفیسر کٹی منی (مانو) بھی اچانک مل گئے۔چندر بھان خیال صاحب، نظام صاحب اور اجئے مالویہ بھی تھے۔اجئے مالویہ کچھ زیادہ ہی سادہ لوح لگے۔یا اندازے کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ رویندر بھون سے لگ کر ہی کمانی اڈیٹوریم ہے۔سب پیدل ہی وہاں تک پہنچے۔ہمارے گلے سے ا، ڈینٹی کارڈ نکال کر ایک بیج لگا دیا گیا۔مسز رینو موہن بھان استقبال کے لیے موجود تھیں۔ انگریزی حروف تہجی کے مطابق ادیبوں کو بٹھایا جاتا ہے۔اس لیے اردو کا نمبر سب سے آخر میں آتا ہے۔اور دائیں سے سب سے پہلے!!جینت مادھو بورا (آسامی)، افسر احمد (بنگالی)، ریتا بورا (بوڈو)، شیو مہتا (ڈوگری)، مامنگ دائی (انگلش)، ارمی گھنشیام دیسائی (گجراتی)، رمیش کنٹل میگھ (ہندی)، ٹی پی اشوکا (کنڑ)، اوتار کرشن رہبر (کشمیری)، گجانن رگھوناتھ جوگ (کونکنی)، اودئے نارائن سنگھ (میتھلی)، کے پی رام نونّی (ملیالم)، راجن توئی جمبا (منی پوری)، شری کانت دیشمکھ (مراٹھی)، بنا ہنگلکھم (نیپالی)، گائتری صراف (اڑیہ)، پنچھتر (پنجابی)، نیرج دیا (راجستھانی)، نرنجن مشرا (سنسکرت)، بھجگا ٹوڈو (نتھالی)، جگدیش لچھانی (سندھی)، ٹی دیوی پریا (تیلگو)، اور بیگ احساس (اردو) آسامی سے شروع اور اردو پر یہ قطار ختم ہوئی۔ایک بک لیٹ شائع کیا گیا تھا۔جس میں ادیب کی تصویر، اس کی کتاب کی تصویر اور اس کا مختصر تعارف تھا۔آخری صفحے پر پوری ''تیئیس کتابوں کی تصویریں تھیں۔تامل کے ادیب انقلاب کو بعد از مرگ یہ ایوارڈ دیا گیا۔پتہ نہیں کیوں ان کی کتاب کی تصویر نہیں شائع کی گئی اسٹیج پر درمیان میں مہمان خصوصی شری کرن ناگر کر، شری چندر شیکھر کمبار (صدر)، مدھوکوشک (نائب صدر) اور شری کے سری نواس راؤ، سکریٹری ساہتیہ اکادمی بیٹھے تھے۔مہمان خصوصی شری کرن ناگر کر، ناول نگار، پلے رائٹ، فلم اینڈ ڈراما کریٹک ہیں۔مراٹھی اور انگلش پر یکساں

قدرت رکھتے ہیں۔ معاصر ہندوستانی ادب کی نمائندگی کرتے ہیں انھیں جرمنی کے سب سے بڑے اعزاز آرڈر آف میرٹ آف دی فیڈرل ریپبلک آف جرمنی'' سے نوازا گیا۔شری چندر شیکھر کمبار گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ہیں۔سنسکرت کے اشلوک سے تقریب کا ٹھیک وقت پر آغاز ہوا۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بالکل پیچھے میڈیا کے کیمرے لگے تھے۔شری کے سرینواس راؤ سکریٹری ، ساہتیہ اکادمی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔نومنتخبہ صدر، نائب صدر ساہتیہ اکادمی اور مہمان خصوصی کا تعارف پیش کیا۔انھوں نے ساہتیہ اکادمی کی سال بھر کی رپورٹ بھی پیش کی۔شری چندر شیکھر کمبار نے صدارتی خطبے میں اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ ملک کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کی موجودگی میں آج وہ بحیثیت صدر ذمہ داری سنبھال رہے ہیں۔انھوں نے کہا کہ پچھلے صدر شری تیواری جی نے جو کام کیے وہ انھیں کے نقش قدم چلتے ہوئے ذمہ داری نبھائیں گے۔انھوں نے ادیب کی معاشرے میں جو اہمیت ہے اسے واضح کرتے ہوئے اظہار کی آزادی پر زور دیا۔اس کے بعد شری کے سری نواس راو نے ایک ایک فن کار کو بلایا مادھو کوشک نے پھولوں کا ہار پہنایا۔ پھر فن کار کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔اس کا تعارف پیش کیا گیا۔سری چندر شیکھر کمبار نے شال پوشی کی اور ایوارڈ دیا۔ شری کے سری نواس نے کبھی انگلش اور کبھی ہندی میں تعارف کرایا۔ تلگو اور اردو انعام پانے والے ساتھ بیٹھے رہے۔ دونوں کا تعلق حیدرآباد ہی سے ہے۔ دیوی پریا کے بعد میرا نام پکارا گیا۔تالیوں کی گونج میں پُر اعتماد قدم اٹھاتے ہوئے اسٹیج کے درمیان پہنچا۔شری مادھو کوشک نے ہار پہنایا اور گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ شری نواس راؤ تعارف پیش کرتے رہے اس کے بعد شری چندر شیکھر کمبار نے شال اڑھائی اور ایوارڈ پیش کیا۔میرے بعد ایوارڈ کی پیش کشی کا سلسلہ ختم ہوا۔شری کرن ناگر کر نے بحیثیت مہمان خصوصی انگریزی زبان میں تقریر کی۔ جو قدرے طویل ہوگئی۔ لمبے قد کے شری کرن ناگر کرتا پائجامہ پہنے، سر پر گھنے چاندی جیسے بال!! مختلف دانشوروں کے حوالوں کے ساتھ تقریر کرتے رہے۔ انھوں نے عدم تشدد پر زور دیا۔شری مادھو کوشک نے سرل ہندی میں دلچسپ تقریر کی۔ بہت ہی مختصر لیکن جامع انھوں نے کہا آج کا دن ساہتیہ اکادمی کے لیے تو بڑا ہے ہی لیکن لیکھک کے لیے بھی بڑا دن ہے۔ ہندوستان کا ہر ساہتیہ کار اپنے من میں یہ ضرور سپنا رکھتا ہے کہ کبھی نہ کبھی عمر کے کسی پڑاو پر مجھے یہ سمّان ملے گا حالاں کہ لیکھک اپنے آپ میں سمانت ہے۔ان کو سمانت کر کے ہم اپنا وقار بڑھاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ تیوار جی کے بتائے ہوئے راستے پہ چلیں گے۔انھوں نے کہا کہ ہر کام میں مہارت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن لیکھک کو بھگوان کی دین ہوتی ہے۔ پُرکرتی نے اسے لکھنے کا کام سونپا ہے۔ جو اپنے آپ میں بہت ہی مہمان کاریہ ہے۔کوئی بھی لیکھک اپنے پریوار کی وجہ سے آگے بڑھتا ہے میں ان کے خاندان والوں کو بھی مبارک باد دیتا ہوں۔ حالات کتنے ہی مشکل ہوں قلم کار اپنے مشن پر ڈٹا رہتا ہے۔ان کی تقریر کے بعد ایک گروپ فوٹو لیا گیا۔سارے فن کار اسٹیج سے اترے تو میڈیا نے ملیالم کے ادیب کے پی رامانونّی کو گھیر لیا۔وہ کچھ کہہ رہے تھے۔ کچھ وقفے بعد کچی پوڈی ڈانس تھا۔ باہر برآمدے میں آئے تو پتہ چلا راما نونّی نے جنید کی ماں کو آج مدعو کیا ہے، اور انھوں نے اعلان کیا کہ انعام کی رقم میں سے صرف تین روپے رکھ کر وہ ساری رقم جنید کی ماں کو دے دیں گے۔ بہت بڑی اور ہمت کی بات تھی۔

دوسرے روز 13/فروری صبح 10 بجے ''رائٹرز میٹ'' پروگرام تھا جو شری مادھو کوشک، نائب صدر، ساہتیہ اکادمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔تمام انعام یافتگان سے تقریریں منگوالی گئی تھیں۔ ہندی یا انگریزی میں تقریر بھیجنی تھی۔ تمام تقریریں پرنٹ کروا کر ایک لفافے میں رکھ کر پریس اور دیگر شرکا میں بانٹ دی گئیں۔ مادھو کوشک جی بار بار کہہ رہے آپ کی تقریر پرنٹ کر دی گئی

صرف اپنے مختصر تاثرات پیش کیجئے۔لیکن ہر شخص پوری تقریر پڑھنے پر تلا بیٹھا تھا۔ وہی مسئلہ!! اردو کا نمبر سب سے آخر میں آتا ہے میں نے سونچا لنچ کا وقت ہو جائے گا اور پتہ نہیں لوگ ہال میں موجود بھی رہیں یا نہ رہیں۔ش۔ک۔نظام دو منٹ کے لیے آئے پھر چلے گئے۔ تقریر مادری زبان میں کرنے کی اجازت تھی۔ زیادہ تر ادیبوں نے اپنے فن سے زیادہ اپنی زندگی کے بارے میں بتایا۔ پھر کوشک جی بے بس ہو کر چپ ہو گئے۔ کہنے لگے اب میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا آپ کا جتنا جی چاہے بولیے۔فون بجا۔نارنگ صاحب کا فون تھا۔مبارک باد دی تفصیلی گفتگو کی۔نارنگ صاحب کی کمی بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔11 رفروری کو ان کی سالگرہ بھی تھی اور 12 رفروری کو ایوارڈ کی تقریب۔ان سے بات کر کے سکون سا محسوس ہوا۔2 بجے کے قریب میرا نمبر آیا۔میں نے ویسے بھی مختصر تقریر ہی لکھی تھی۔ میں نے کوشک جی سے مخاطب ہو کر کہا انھوں نے جتنی بار تقریریں مختصر کرنے کو کہاں میں اپنی تقریر مختصر کرتا گیا۔ کوشک جی نے ہنس کر کہا ''چلو کسی نے میری بات تو مانی'' میں نے اپنے لکھنے کے آغاز کے بارے میں بتایا۔اس سنہرے دور کے بارے میں بتایا جب کتب خانے بھرے ہوتے تھے اور گھریلو خواتین کرائے کی لائبریریوں سے ناول منگوا کر روز ایک ناول پڑھتی تھیں۔ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اثرات میرے فن پر کیا پڑے ان کے بارے میں بتایا۔ میں نے حیدرآباد کی ملی جلی تہذیب اور اپنے افسانوں کے پس منظر کے متعلق گفتگو کی۔ جب تقریر ختم کی تو سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔اسٹیج سے اترا تو کئی لوگوں نے گلے لگایا۔میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ یہ سب اردو زبان کی طاقت اردو زبان کا جادو تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ اردو سننا چاہتے ہیں۔اردو ان کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ لنچ پر کئی جرنلسٹ ملے۔لیکن میں نے دوسرے روز اپنے دوست نامور شاعر نعمان شوق سے وعدہ کر لیا تھا کہ آل انڈیا ریڈیو کے لیے انٹرویو ریکارڈ کرواؤں گا۔اس لیے بیشتر صحافیوں سے معذرت کر لی۔ایک اسکالر میری تقریر سے اتنا متاثر ہوا کہ مجھ سے کہنے لگا ''سر میرے باپ نے ہماری زندگی تباہ کر دی۔ وہ سخت مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ایک بار ناول پڑھتے دیکھ کر اس زور سے لات ماری کہ میں نے پھر کوئی ناول نہیں پڑھا۔میری بہن کی شادی ایک عمر رسیدہ آدمی سے زبردستی کروادی۔ مذہب کے خلاف اس کے سخت جذبات تھے۔میں نے اسے سمجھانے کی کوشش اور آہستگی کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا اور ٹھہرتا تو شاید وہ رو پڑتا۔رات کے کھانے پر سب ایک دوسرے سے ملے تو چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔کچھ لوگ رات میں واپس ہو گئے۔ ہماری فلائٹ دوسرے دن شام میں تھی۔صبح نعمان شوق گاڑی لے کر آ گئے۔ سیدھے ریڈیو اسٹیشن گئے۔ بہت ہی اچھا انٹرویو کیا انھوں نے....!! بہت اچھے شاعر ہیں۔80 کے بعد لکھنے والے شاعروں میں ایک نمایاں نام ہے۔ ریکارڈنگ کے بعد خورشید اکرم بھی آ گئے۔کچھ دیر باتیں کیں۔پھر لوٹتے ہوئے خورشید اکرم کو ان کے دفتر چھوڑتے ہوئے واپس آ گیا۔شام جب ہم ایوارڈ کے ساتھ لوٹ رہے تھے تو انڈین ایر لائنز کا بڑا طیارہ تھا تین رو والا۔آرام دہ۔ٹی وی بھی موجود تھا۔ پتہ نہیں کتنی بار دہلی کا سفر کیا۔گنتی بھی یاد نہیں۔لیکن اب لوٹتے وقت جو سرشاری کی کیفیت تھی وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔1971ء میں اس سفر کا آغاز ہوا تھا اور 2017ء میں یہ سفر ایک ایسی منزل تک پہنچا جس کی آرزو ہر لکھنے والے کے دل میں ہوتی ہے۔سفر جاری ہے اور جاری رہے گا....!!

☆☆☆

K. CHANDRASEKHAR RAO

Chief Minister
Telangana

Hyderabad

Dated: 08.01.2018

Dear Prof. Mohammed Baig Ehsas Sahab,

It is heartening to note that Sahitya Academy award for 2017, in genre of Short story writings in Urdu, is bestowed upon you for the year 2017.

Congratulations on well deserved recognition for your long and illustrious work as a writer, researcher and Urdu Professor. The value of the Award is enhanced, considering the fact that its just the third time, any scholar is recipient of the honour for his contribution to Urdu language, since the inception of Sahitya Academy more than 50 years ago.

Its an honour for the entire Urdu speaking community, more particularly for us in the state of Telangana. I am sure that you are aware that my government has declared Urdu as Second official language and has initiated several path-breaking measures for its development.

Once again congratulations on your achievement. May many more laurels come you away in future.

With regards,

Yours sincerely,

( K. CHANDRASEKHAR RAO )

Prof. Mohammed Baig Ehsas Sahab
# 8-1-398/PM/416, Yaser Enclave
Flat No. 401, Paramount Hills
Toli Chowki, Hyderabad.

## راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع

آپ بیتی

# یادیں

بس میں نے سوچا کہ ہمارے اہلِ قلم کو تازہ ہوا اور روشنی کے لیے اپنے ذہن کے دریچوں کو ذرا اور کھولنا چاہیے۔ ان دریچوں سے جھانک کر دیکھیں کہ ہمارے اطراف، ہم سے قریب زبانوں میں کیا ہو رہا ہے اس کے لیے ان زبانوں کے شہہ پاروں کا نہ صرف خود مطالعہ کریں دوسروں تک پہنچانے کے لیے ان کا اپنی زبان میں ترجمہ بھی کریں۔ آج دنیا مٹھی میں آ گئی ہے، انگلی کے اشارے پر ہے فکری وسعتیں ہمیں چیلنج کر رہی ہیں کہہ رہی ہیں ''کھول آنکھ زمیں دیکھ فضا دیکھ

'' آج کا دور آدان پردان کا دور ہے یہی لین دین زبان و بیان افکار وخیالات کو منور و مفتخر کرے گا۔

میں آج، ایک ایسے ہندی شاہکار کو پیش کرنے جا رہی ہوں جو ہندی کا طویل رزمیہ ہے اس کا نام ''اندر پرستھ Indra Prastha قدیم ترین زمانے میں یہ بھارت کا صدر مقام تھا۔ مہابھارت میں اندر پرستھ کا ذکر آیا یہ زمانہ غالباً 1000 ق۔م کا ہے۔ مشہور مورخ فرشتہ لکھتا ہے کہ دہلی کو Raja Dhilu نے بسایا تھا دہلی کا نام اسی راجا کے نام سے مشتق ہے۔ دہلی کے کئی نام بدلے سنسکرت میں اس کا ہستنا پور جس کے معنی ہاتھیوں کا شہر ہے۔ یہ شہر عجیب شہر ہے بار بار اجڑتا اور بار بار بستا رہا ہے۔ اوپیندر کمار نے ''اندر پرستھ'' کی بنیاد مہابھارت کے اسی شہر پر رکھی ہے۔

اوپیندر کمار ہندی کے مشہور شاعر ہیں۔ ڈیفنس منسٹری میں پرنسپل سکریٹری کے عہدے سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ شاعری بہت دیر سے شروع کی مگر بہت جلد اس میدان میں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 1979ء میں منظر عام پر آیا اب تک ان کے ۳ شعری مجموعے شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں ''اداس پانی''، ''ننگے پاؤں''، ''چاندنی آدھی''!! اب ''اندر پرستھ'' ان کا چوتھا شعری کارنامہ ہے جس کے چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

اوپیندر کمار کو اب تک کئی سمان مل چکے ہیں ان میں سے چند ہیں ''کاویا رچنا سمّان'' (نیشنل پریس آف انڈیا کا سمّان)، ساہتیہ کوی سمان، ہندی اکادمی دہلی، ساہتیہ کار سمّان' ہندی اکادمی دہلی، راشٹر کوی سمان ہے۔ میتھلی شرن گپت سمان 2016ء میں ملا ہے۔

### 'اندر پرستھ'

شاید یہی اندر پرستھ ہے
بادلوں کے آغوش میں چھپا ہوا
بجلیوں کی کوند سے
چمک چمک جاتا
بھولی بسری کتھاؤں اور تاریخ کے دھندلکوں میں
کچھ چھتا چھپاتا کچھ دکھتا دکھاتا
شاید یہی اندر پرستھ ہے
وقت کے ساتھ ساتھ دوڑتا۔ دوڑ میں چھلانگیں بھرتا
کبھی اس سے تھوڑا پیچھے تو کبھی اس سے تھوڑا آگے
زمانے کو بانٹنے والی دوراہے کے درمیان بھول بھلیوں میں چکر کاٹتا
کبھی اس یگ تو کبھی اس یگ سے بتاتا
شاید یہی اندر پرستھ ہے
سمندر کی جھاگ اوڑھتا ہوا
کرنوں کی رتھ میں لگاتا چھلانگ

ہوا کے گھوڑے باندھ
ایک یگ سے دوسرے یگ تک
من تڑپتا، سمجھو من للچاتا
پریوں کے جیون میں سما جاتا
اور اندر پرستھ پیڑی در پیڑی
فطرت اور انسان کا سندر ملن
من میں جیون میں ہے۔
چھاتی کے ابھار سے لے کر بدن کی کپکپاہٹ تک
اگر اتنی مٹھاس ہے اندر پرستھ میں
تو پھر جنت کیا ہے؟
اندر کا دربار
ناچتی اپسرائیں
پریم تو دھرتی کا تحفہ ہے
مگر انسان اس دیولوک سے حیران
وہ دیولوک جو بادلوں میں چھپا ہوا ہے
جہاں پریمیوں کی نظریں نہیں پہنچ پاتیں

دل میں چھپے سچ جیسا
وہ نہ تو چھوٹا ہے نہ ہاتھ آتا ہے
اس کے انتظار میں مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں
اس کے قدموں کی آہٹ کی امید میں
مڑ مڑ کر سنتے ہیں

سرپٹ دوڑتا
دھول اور دھند بھری آندھیوں میں ڈوبتا تیرتا
طوفان میں جانے کتنا انمول، کتنا کچرا ڈھوتا
ہانپتا، بھاگتا، دوڑتا

شاید ہی اندر پرستھ ہے
دھرتی کی بانہوں میں سوتا
انگڑائی لیکر اسے جگانا
الجھن سلجھاتا من کو جانچتا
بھاتا جیون کے اندر
سامنے جو بیٹھا ہے
اسے بھی تو معلوم نہیں کہ
دونوں صرف ایک سچائی کے حق کی راہ کے راہی ہیں
جو ہے سوچ سے تخیل سے آگے
حالات سے دور
تقریباً اندر پرستھ سا ہی دکھائی دیتا ہے
شاید یہی اندر پرستھ ہے
دعاؤں کے دھیمے سروں میں امیدوں کے خوشیوں کے گیت گاتا
خود ہی کے دربار میں خود ہی بار بار حاضری دیتا
آئے اندر آئے
ارویشی کو لائے
زندگی کے لمحات کو چمکائے
سونا بنائے
کیا اندر کے آنے سے ہم بھی ویسے ہی ہو جائیں گے
ہاں ہو جائیں گے
ہمارے تن میں کلپ پُروکش بھی تو ہے (کلپ پروکش ایک درخت
جس سے جو مانگو مل جاتا ہے)
اچھا کلپ پُروکش
ہاں ہاں دیکھئے

دیکھتے دور کچھ دور چل کر دیکھئے
کوئی رات سو کر دیکھئے
بانہیں پھیلا کر دیکھئے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھئے
کھلنے دیجئے آرزوؤں کے پھول
محبت کے ماروں کو جینے دیجئے۔تب
ہاں تب ہی تو وہ اندر پرستھ ہے
راستے سے دور نہ اس کی پہنچ ہیں
کن رتھوں پہنچے پریم کی نہروں پر چلتے ہوئے
وقت کی للکار کو ان سنا کرتے
من میں جگہ کہاں کسی مہابھارت کی
وہ تو ایک طے شدہ ملن ہے
چھپی ہوئی تڑپ ہے
وہ نغمہ ہے
وہ جیوتی ہے
اندر پرستھ کے راستے انوکھے
کلپ پُروکش کی دین انوکھی
کوئی آئے میرے پیچھے
تب کلپ پروکش کی بانہوں میں
میں کلپ پروکش ہو جاتا ہوں
کسی کا لالچی من کہیں مجھے نہ چرا لے

مجھ سے مانگ لے میرا جیون میرا جوبن
تیری خدمت میں کچھ بھی سونپ سکتا ہوں
پریم کس طرح دوں
میں نے تو پریم کیا ہے

وہ کچھ بھی مانگ سکتی ہے
اسی کا تو ہے سب کچھ
میرے اندر ہی تو سمایا ہے وہ
کلپ پروکش کو ہٹا بھی سکتی ہے
اگر جگہ نہ ہو جیون میں

کل رات میں جو اس کی بانہوں میں لپٹ کر سویا
کروٹ بدلی تو کھل گئی نیند
دیکھا تو کئی یگ بدل چکے تھے
کتنے ہی سر منڈل بدل چکے تھے

ارے اس میری محبوبہ کا کیا ہوا
ہم سو بار جنم لیتے ہیں اور سو بار راسی کو جیتے ہیں
کیا یہ ایک ہی حالت ہے
یا سچ ہے

اب کروکشتر ہی سے ہوگا حل
کیا اس کے جیون میں
انسان کی کہانی ہے
انصاف کی کہانی ہے

پانچ پتیوں کے سپرد اسے وقت نے کیا
صرف اتنا ہی نہیں
اس نے تو پریم کیا صرف ارجن سے
اور لُٹ گئی اسی کے ہاتھ
کئی بیاہوں نے کچل ڈالا دروپدی کا من

مردوں نے اسے شرمندہ کیا بھرے سماج میں
مردحاکم سماج
یگوں یگوں سے اب تک چلا آ رہا ہے
مگر دروپدی، ارجن، کرن ہوتے ہی رہے
روتے ہی رہے
سامنے کھڑا رہا کروکشتر
ارجن، کرن نے ہتیار اٹھائے
سارتھی (رتھ بان) نے کر دیا انہیں ایک دوسرے کے سامنے

ایک جیتا، گواہ ہے سنجے
گتیا سے لے کر پورے کروکشتر کا
راضی کون ہے اس سے
کیا ساتھ دیتا ہے کوئی اتنی بڑی ناانصافی کا
ہماری صدیوں نے دیکھا ہیں کروکشتر
مگر اس کے زخم باقی ہیں
اور اس سے کوئی متفق نہیں
بیچ کی صدیوں نے تو کچل ڈالا تاریخ کو
پریم کے ہر ایک روپ کو چھوڑ دیا تن تنہا چیخوں میں

آئے اندر آئے
پریم کا تحفہ پائیے
دیکھئے دھرتی کا پریم
آنکھوں میں آنکھیں ڈالیے
آپ کے سورگ سے اندر پرستھ ہی اچھا ہے
یہاں تو سب کچھ ہے
ہریالی ہے نشہ ہے

ہاں! آپ کو شاید اروشی کو یہاں لانا ہے
سنجوگ اور ملن کی گھڑی اندر پرستھ ہی تو دے سکتا ہے

اندر یہ جان کر ہی تو آئے آپ
ورنہ فردوس کا سکھ چھوڑ آتے کیوں دھرتی پر
ہم سے سیکھتے جو آپ نے سکھایا ہے
شاید یہی اندر پرستھ ہے

جانئے سکھ آنند
دھرتی کا اُپکار ہے
آپ کے آکاش میں دھوپ ہوتی کہاں
آغوش ملن کا ہے مگر ہجر کہاں
عادت ہے آپ کو کئی رقاصاؤں کی
ہم دھرتی پر چاہتے ہیں صرف ایک کو
بھول کر کئی ایک کو
پوروا نے اروشی سے پریم کیا
اس کو کیا نہیں دیا
بانہوں میں لے کر دیتا رہا بھروسہ
کہ وہ نہیں جا پائیگی۔ رہے گی سدا میری

پر کہاں اندر؟
آپ ہی نے تو دی بددعا
اور ایک ہی جھٹکے میں پریم کو چھوڑا
چلے گئی اروشی آپ کے پاس
اندر لوک بولے گھر ہے اس کا
تن بدن تو مرا تھا

ارویشی کو دھرتی پر لائیں گے اپنے ساتھ
وہ پھر مجھے چاہے یا نہ چاہے
کسی اور کو چاہے گی تو مشکل ہوگی
ہمت ہے تو لانا
ورنہ وہ مجھے ڈھونڈتی آئے گی
میرے مرد نے اسے مکمل عورت بنا دیا
آغوش ہی آغوش، پیار ہی پیار
ہم دونوں کا حسن عالم تاب تم کیا جانو
تم تو کبھی ایک کے نہیں رہے
اندر کے دربار میں تو میں کئی اپسرائیں
آپ کے اردگرد ناچتی گاتی رجھاتی
میرے پاس تو ایک ہی ارویشی تھی
اب بھی ہے
پریم کبھی ختم نہیں ہوتا
کہاں ہے کسی کے پاس کوئی اوتار
جس پر گزرتی ہے وہ پریمی ہی انسان ہوسکتا ہے
اندر نہیں
ارویشی کو لے کر اندر دھرتی پر آتے ہیں
پودے، سمندر کرتے ان کا استقبال
کھیت، کھلیان کرتے ان کا سواگت، استقبال
پھر سے ارویشی کی آنکھیں
پُرروا کو تلاشتی ہیں
ادھر ادھر دیکھتی ہیں
آخر اس کا پریمی اس دھرتی کا ہی تو تحفہ تھا
اس کے من کا ساتھی تھا
ممکن ہوتا تو وہ اسے ہی بار بار مالا پہناتی
من ہی من کہتی ہے وہ میرا من میت کہاں ہے

وقت کتنا بھولا ہے
سمجھ نہیں پاتا کہ ہم
کلپ پروکش تک پہنچے کیسے
اندر پرستھ کے راستے کئی
شاید یہی اندر پرستھ ہے
زمانے کے آفریدہ

☆☆☆


شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

طنز و مزاح

# ادب اور ازدواجی مسائل

کسی ادیب سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے اگر اس کے صاحب نظر ہونے کی گواہی دیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کوئی معمولی ادیب نہیں ہے۔ زاہدہ حنا جو کچھ لکھتی ہیں، وہ افسانہ ہو یا اخباری کالم، ان کی بہت سی باتوں سے اتفاق کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا، اس کے باوجود ہماری رائے یہ ہے کہ وہ جب لکھتی ہیں تو لکھنے کا حق ادا کر دیتی ہیں۔ وہ جدید اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہیں۔ افسانہ نگاری کے لیے زندگی کا براہ راست مشاہدہ پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ اگر اس کے ساتھ لکھنے والے کا مطالعہ، خصوصاً اس معاشرہ کی تاریخ کا مطالعہ جس میں وہ سانس لے رہا ہے، وسیع ہے تو اس کی نظر ساحل پر کھڑے ہوئے تماشائی کی نظر کی طرح سطح میں نہ ہوگی بلکہ اس غواص کی نظر بن جائے گی جو دریا کی تہہ کی خبر لاتا ہے۔ مشاہدے اور مطالعے کی وسعت کے ساتھ اگر کوئی افسانہ نگار زبان و بیان پر بھی قدرت رکھتا ہو تو اسے قرۃ العین حیدر کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ زاہدہ حنا بھی قرۃ العین حیدر کے آس پاس کہیں موجود نظر آتی ہیں۔

یہاں تک لکھنے کے بعد ہم نے اپنے لکھے پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا یہ ہمارے کالم کا عام انداز نہیں ہے۔ ہم کسی کی تعریف میں اتنی دریا دلی کا مظاہرہ اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ موضوع خود ہماری ذات نہ ہو۔ مندرجہ بالا پیراگراف تو کسی ایسے مقالے کا حصہ نظر آتا ہے جیسا نظیر صدیقی نے پروین شاکر کی شاعری پر یا علی سردار جعفری نے عشرت آفریں کی کتاب پر لکھا تھا۔ خیر، اب تیر کمان سے نکل چکا ہے، ہم اپنے الفاظ واپس نہیں لے سکتے کہ ایسے ''آلودۂ توصیف غیر'' الفاظ ہمارے کس کام آئیں گے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم محترمہ قرۃ العین حیدر سے معذرت کر لیں کہ اس نے آس پاس زاہدہ حنا کو ہم نے نہیں بھیجا، وہ خود اپنی مرضی سے وہاں موجود ہیں۔

زاہدہ حنا پر لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ لاہور کے روزنامہ ''پاکستان'' میں ان کا ایک دلچسپ انٹرویو شائع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے پاکستان کی موجودہ ادبی صورت حال سے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''ہماری علمی و ادبی تقریبات کی مسند نشینی جاہل وزیروں پر اجہل مشیروں کے حصے میں آتی ہے۔ ایسی تقریبات کی اگلی صفوں میں کمشنر اور ڈپٹی کمشنر بٹھائے جاتے ہیں۔ انکم ٹیکس افسر اور اسمگلر بار پاتے ہیں۔ ہم نے اپنی نوکر شاہی کے معمولی اہل کاروں کو علم و دانش کا ہمالیہ پہاڑ ٹھہرایا۔ کوئی افسر غالب کے بیس شعر یاد کر کے آجائے تو ہم اس سے اپنی ادبی محفلوں کی صدارت کراتے ہیں''۔

محترمہ نے واقعی بڑی دردناک تصویر کھینچی ہے۔ ایسی ہی دردناک تصویریں کھینچنے پر علامہ راشد الخیری کو ''مصورِ غم'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ زاہدہ حنا بھی مصورہ غم کہلانے کی مستحق ہیں۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ صد فی صد درست ہے لیکن اس میں جاہل وزیروں اور اجہل مشیروں وغیرہ کا کوئی قصور نہیں۔ انھیں بلایا جاتا ہے تو وہ ادبی تقریبوں میں آتے ہیں، ان سے درخواست کی جاتی ہے تو وہ مسند صدارت پر جلوہ افروز ہو جاتے ہیں۔ ہم نے تو آج تک یہ نہیں سنا کہ کسی وزیر یا کمشنر نے قانون نافذ کرنے والے

اداروں کی مدد سے زبردستی علمی وادبی تقاریب کی صدارت کی ہو یا کسی تھانے دار نے سپاہی بھیج کر شاعروں کو تھانے بلایا ہو اور اپنی صدارت میں مشاعرہ منعقد کیا ہو۔ اس صورت حال کی ساری ذمہ داری ان ادیبوں پر عاید ہوتی ہے جنھوں نے ادب کو کاسہ گدائی بنا رکھا ہے۔ وزیر اور کمشنر بڑی چیز ہیں، ہمارے ادیب تو ٹی وی اسٹیشن کے دروازے پر کھڑے ہوئے چوکیدار سے بھی اسی عقیدت سے ملتے ہیں جس عقیدت سے غالب اپنے محبوب کے پاسبان کے قدم لیتا تھا۔

محترمہ نے اس سرکاری افسر کا ذکر بھی بڑی حقارت سے کیا ہے جو غالب کے بیس شعر یاد کر کے آجاتا ہے اور ادبی تقاریب کی صدارت کرتا ہے۔ ہمارے رائے میں سرکاری افسر ستائش کا مستحق ہے کہ اس نے غالب کے بیس شعر تو یاد کر لیے، اس کے برعکس ہمارے شاعروں کا یہ حال ہے انھیں سوائے اپنے شعروں کے کسی دوسرے کا کوئی شعر یاد نہیں ہوتا۔ یقین نہ آئے تو کسی بھی شاعر سے غالب کے صرف پانچ شعر سنانے کی فرمائش کر کے دیکھ لیجئے۔ وہ اپنے ہی پانچ شعر غالب کے نام سے سنا دے گا۔ سرکاری افسر غالب کو بے آبرو نہیں کرتا۔ اس کے نام سے اسی کے شعر سناتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں محترمہ نے یہ فرمایا کہ ہمارے شاعروں کو شادی نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ ان کے پاس اس رشتے کو نبھانے کی فرصت ہوتی ہے نہ حوصلہ۔ اور اگر غلطی سے یہ لوگ شادی کر ہی لیں تو انھیں اس رشتے کو نبھانے کا سلیقہ عوام سے سیکھنا چاہیے۔

پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ اس بیان میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے ''شاعری'' کی جگہ ''شادی'' کا لفظ چھپ گیا ہے۔ یعنی محترمہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہمارے شاعروں کو شاعری نہیں کرنی چاہیے۔ بات معقول ہے کہ ہمارے شاعر آج کل جس طرح کی شاعری کر رہے ہیں، اس سے نہ صرف خود ان کی عزت میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ شاعری کی آبرو بھی خطرے میں پڑ چکی ہے..... جب بیان کو غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ محترمہ شاعروں کو شاعری سے نہیں، شادی ہی سے اجتناب کا مشورہ دے رہی ہیں۔

ہم شاعر نہیں ہیں لیکن شاعروں کے ہم درد ضرور ہیں۔ اس لیے ہم محترمہ کے مشورے کو نا قابل قبول ہی نہیں، ادب کے لیے نقصان دہ بھی سمجھتے ہیں۔ اگر شعرا حضرات شادی نہ کرتے تو ہمارے بہت سے بڑے شاعر پیدا ہی نہ ہوتے کیوں کہ وہ خود شاعروں کی اولاد میں سے ہیں۔ مثلاً ماضی میں میر انیس کے خاندان میں سات پشتوں تک شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر میر انیس کے جد امجد زاہدہ حنا کے مشورے پر عمل کرتے تو اردو شاعری میر انیس جیسے بڑے شاعر سے محروم رہ جاتی۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں جون ایلیا کے خاندان میں بھی چار پشتوں سے شاعری ہو رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ محترمہ زاہدہ حنا کے مشورے پر عمل نہیں ہوا ورنہ آج جون ایلیا جیسا طرح دار شاعر ہمارے درمیان موجود نہ ہوتا۔

محترمہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شعرا حضرات اگر غلطی سے شادی کر لیں تو انھیں اس رشتے کو نبھانے کا سلیقہ عوام سے سیکھنا چاہیے۔ محترمہ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ شادی کوئی شاعری نہیں ہے جو کسی غلطی کے نتیجے میں وجود میں آئے۔ آدمی خوب سوچ سمجھ کر اور خاصی رقم صرف کر کے شادی کرتا ہے اور پھر شادی مزاحمتی ادب جیسی کوئی چیز بھی نہیں ہے جو عوام کے مفاد میں اور عوام کے مشورے سے کی جائے۔ شعرا تو ہر معاملے میں عوام کی رہنمائی کا

فریضہ انجام دیتے ہیں، شادی کے مسئلے میں وہ عوام کی رہنمائی کیوں کر قبول کر سکتے ہیں۔ محترمہ سے گزارش ہے کہ وہ اپنی افسانہ نگاری اور کالم نویسی کی حدود میں رہیں اور شاعروں کے ازدواجی معاملات کو انھیں پر چھوڑ دیں۔

جون ایلیا کا ذکر آیا ہے تو یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ زاہدہ حنا کے انٹرویو سے کچھ دن پہلے روزنامہ ''پاکستان'' میں موصوف کا بھی ایک نٹرویو چھپا تھا جس میں انھوں نے اپنی شادی کے حوالے سے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جنھیں از راہ شائستگی نقل نہیں کیا جا سکتا۔ شاید ایسی ہی باتوں کی وجہ سے زاہدہ حنا نے شاعروں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جون ایلیا کے انٹرویو میں کئی اور دلچسپ باتیں بھی ہیں لہٰذا اگر ہم کچھ وقت اس سریر آرائے اقلیم سخن کے ساتھ بھی گزار لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

جو ایلیا کی عادت ہے کہ اپنے ہر انٹرویو میں اپنے جد امجد کے بارے میں کوئی نہ کوئی چونکا دینے والی بات ضرور کہتے ہیں۔ چند ماہ پہلے انھوں نے ایک انٹرویو میں اپنے جدّ امجد کے لیے ''اوباش'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس پر ہم نے ٹوکا تو اخبار میں وضاحت کی کہ انھوں نے ''عشق باز'' کا لفظ استعمال کیا تھا جسے انٹرویو لینے والے نے ''اوباش'' سمجھا۔ اس وضاحت سے معاملہ اور سنگین ہو گیا کیوں کہ نور اللغات جیسے مستند لغت میں ''عشق باز'' کے معنی ''حسن پرست''، عاشق مزاج اور عیاش'' لکھے ہیں۔

تازہ انٹرویو میں جون ایلیا نے یہ مژدہ سنایا ہے کہ ان کے جد امجد کے مزار پر بچھو نہیں کاٹتے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کرہ ارض پر ایک جگہ تو ایسی ہے جہاں بچھوؤں کے ڈنک بے ضرر ہوتے ہیں۔ تاہم جون ایلیا نے یہ نہیں بتایا کہ صاحب مزار نے آخر بچھو کیوں پال رکھے ہیں۔

جون ایلیا نے یہ بھی بتایا ہے کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو فلسفی ہوتے اور اگر فلسفی نہ ہوتے تو پہلوان ہوتے۔ پہلوانی سے موصوف کو بچپن سے دلچسپی ہے۔ انھوں نے امرو ہے کے نامی گرامی پہلوانوں سے یہ فن سیکھا ہے۔ فرماتے ہیں ''ایک زمانے میں میں دودھ کا ایک گلاس پیتا تھا۔ ڈنڈ لگاتا تھا اور دیوار پر مکا مارتا تھا کہ اب تو یہ دیوار گر ہی جائے گی کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ بہت بڑا پہلوان بن گیا ہوں۔''

جون ایلیا پر ہمیں رشک آیا کہ انھوں نے وہ اچھا زمانہ دیکھا ہے جب آدمی دودھ کا ایک گلاس پی کر پہلوان بن جاتا تھا۔ اب تو کوئی بالٹی پھر دودھ بھی پی ڈالے تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اول تو دودھ خالص نہیں ملتا، دوسرے دودھ کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اس کا صحت پر منفی اثر ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی پہلوان بننے کی بجائے جون ایلیا بن جاتا ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں، اچھا ہوا کہ جون ایلیا پہلوان نہیں بنے ورنہ وہ مکے مار مار کر شہر کی ساری دیواریں گرا دیتے۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ موصوف پہلوان نہیں بنے تو کیا ہوا، پہلوان سخن تو وہ ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو اپنے زورِ سخن سے سارے عالم کو تہ و بالا کر سکتے ہیں لیکن آرام پسندی کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کرتے۔ آرام پسندی کا تو یہ عالم ہے کہ انھوں نے بقول خود ایک عرصے سے کنگھا نہیں کیا۔ استاد لاغر مرادآبادی کا بھی یہی حال ہے۔ ایک مدت سے ان کی زلفیں بے نیاز شانہ ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ''آدمی کنگھا اس وقت کرتا ہے جب وہ منھ دھوتا ہے۔ ہم کبھی پہلے مرحلے ہی سے نہیں گزرے تو دوسرے مرحلے تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔''

(۱۰ر نومبر ۱۹۹۴ء)

شاعری

# نظم وغزل

احسن رضوی

## وہ دن دور نہیں

سمندر، ندی اور تالاب
آلودہ ہو جائیں
تو مچھلیاں سطح آب پر آجاتی ہیں
سانس لینے کے لیے
پرندوں کو سازگار ماحول نہ ملے
تو علاقہ بدل لیتے ہیں
کچھ دنوں کے لیے
خانہ بدوش لوگ بھی نامساعد حالات میں
نقل مکانی کرتے ہیں
معقول زندگی گزارنے کے لیے
لیکن جب انسان کی بنیادی ضرورتیں
جیسے صاف ہوا اور پانی بھی میسر نہ ہوں
تو کیا کیا جائے
پانی تو ہم عرصہ دراز سے خرید کر پی رہے ہیں
اور اب وہ دن بھی دور نہیں
جب ہمارے ساتھ
آکسیجن کا سلنڈر بھی رہے گا
سانس لینے کے لیے
زندہ رہنے کے لیے

جو لکھتا ہے وہ پڑھنا چاہتا ہوں
کہ میں اب خود سے ملنا چاہتا ہوں

کوئی چہرہ ہو پڑھنا چاہتا ہوں
میں دنیا کو سمجھنا چاہتا ہوں

یہ سچ ہے عہد پیری میں ہوں کب سے
پر اب بھی کام کرنا چاہتا ہوں

ملا ہے جو بھی اب تک غازۂ غم
رخ گیتی پہ ملنا چاہتا ہوں

جو منظر اب نظر کے سامنے ہے
بہر صورت بدلنا چاہتا ہوں

خطوط زندگی جو ہیں نظر میں
میں انہیں رنگ بھرنا چاہتا ہوں

یہ خواہش ہے کہ پھر لہروں سے کھیلوں
سمندر میں اترنا چاہتا ہوں

شاعری

# ثلاثی

کوثر صدیقی

(۱)

پر بندھے ہیں مرے نشیمن سے
میں کہیں اڑ کے جا نہیں سکتا
رشک فردوس اپنے گلشن سے

(۲)

ہو رگوں میں لہو کی گر ہلچل
زخمِ شاخِ بُریدہ سے کوثر
پھر نکل آتی ہے نئی کوپل

(۳)

صبح جاتا ہوں شام آتا ہوں
رکھ کے زخموں پہ دھوپ کا مرہم
رات کا درد بھول جاتا ہوں

(۴)

غنچۂ لفظ جب چٹکتا ہے
تیرے کورے بدن کی خوشبو سے
میرے شعروں کا دل مہکتا ہے

(۵)

یہ حقیقت اصولِ فطرت ہے
اک حقیقت ہے ہر فسانے میں
ہر فسانے میں اک حقیقت ہے

(۶)

ایسے منظر سے دل دہلتا ہے
سونگھ کر پھول پاؤں کے نیچے
کوئی بے رحم جب کچلتا ہے

(۷)

کہکشاں کے چمکتے رہنے سے
آسماں خوش نما سہی لیکن
دور اندھیرے تو ہو نہیں سکتے

(۸)

کرب بکھراؤ کا میں سہتا ہوں
ریت ہوں مُشتِ وقت میں کوثر
لمحہ لمحہ بکھرتا رہتا ہوں

شاعری

# غزلیں

ستار صدیقی

یہ سوچتا ہوں، کبھی خود کو آزماؤں میں
کسی پہ وقت بُرا آئے کام آؤں میں
میری غزل کے اجالے، کسے دکھاؤں میں
سنے جو ڈوب کے لے میں مری ''تو'' گاؤں میں
فضا میں اڑتے ہیں ''طیارے'' آگ برساتے
پتنگ میری ''ہری ہے'' کہا ں اڑاؤں میں
میری گلی میں ہیں؟ سب لوگ آستیں والے
بچوں میں کس سے، کہاں آستیں چڑھاؤں میں
برا لگے گا اسے، ہم سفر ہے وہ میرا
اگر سنوں نہ اسے ، اور نہ سر ہلاؤں میں
میں اس قدر بھی ، قد آور، تو ہوں نہیں، پھر بھی
تمہاری بزم میں، کیسے، کہاں، سماؤں میں
میں اپنے آپ سے بھی دور جا چکا شاید
زمانہ دے کبھی فرصت تو پاس آؤں میں
میں بھول جاتا ہوں ہر بار اب یہ ڈر بھی ہے
کہیں پہ رکھ کے نہ اپنے کو بھول جاؤں میں
وہ رونقیں مجھے کیوں شہر کی بلاتی ہیں
ہرے بھرے ہیں میرے گاؤں ٹھنڈی چھاؤں میں
ہوا سنا ہے کہ پھولوں کو گد گداتی ہے
اگر یہ سچ ہے تو کانٹوں کو گد گداؤں میں

خیالوں میں ہے، دل کی دھڑکن میں ہے
کہاں ہے کوئی ایسا، جو من میں ہے
میں تنہا تھا گھر میں پہ باد آگیا
کوئی ایک مجھ جیسا ، درِ من میں ہے
ادھر بادلوں کو ، برسنے کی ضد
ادھر جاں کسانوں کی خرمن میں ہے
مری بانسری میں وہ جادو کہاں
ادا جھومنے کی تو ناگن میں ہے
ہر اک شعر میں مرے، ندرت کا رنگ
غزل میں بھی خوشبو جو گلبن میں ہے
کئی شعر میرے اسے یاد ہیں
مری شاعری شمع روشن میں ہے
پسند اس کی گویا اس کی طرح
اشاروں ،کنایوں کی چلمن میں ہے
وہی زندگی کے ، ستم، غم، الم
وہی زہر، جو سانپ کے پھن میں ہے
منا کر اسے، گھر بلا لائی ، ماں
یہ بیٹی کا دل اب بھی کنگن میں ہے

شاعری

# غزلیں

جنوں اشرفی

وقار یوں ہی نہیں میں نے بھی گنوایا تھا
جہاں نہ سر تھا جھکا نا وہیں جھکا یا تھا
اسی نے پشت پر خنجر مری چلایا تھا
جسے خلوص سے میں نے گلے لگایا تھا
فضا میں پھیل گئی بوئے مفلسی میری
ذرا جو شوق تمنا نے سرا ٹھا یا تھا
مذاق گردش خورشید کیا کہوں تم سے
بڑھایا تھا قدر و قامت کبھی گھٹایا تھا
تمام عمر اُجالوں کی پھر نہ دید ہوئی
جو ایک بار اجالے پہ مسکرایا تھا
دعا سلام کسی سے نہ گفتگو کوئی
ہمارا شہر ہمارے لیے پرایا تھا
متاع سے تعمیر جو عمارت کی
نقوش ذات نے میری اسے مٹایا تھا
وہیں سے نور جنوں امن کا نمو ہوگا
جہاں پہ آپ نے میر الہو بہایا تھا

نہ آدمی نہ کوئی اس کا شائبہ باقی
ہوا میں رہ گئی بس گونجتی صدا باقی

کوئی اصول وضوابط نہ قاعدہ باقی
حساب جرم نہ اندیشۂ سزا باقی

کچھ اس طرح سے ہمیں مصلحت نے توڑا ہے
نہ ولولہ نہ جنوں ہے نہ حوصلہ باقی

نہ دل میں جوش نظر میں نہ دلکشی پہلی
مگر ہنوز محبت کا ہے نشہ باقی

اگر جو بچھڑو تو دل میں رہے کسک قایم
ملو تو ایسے رہے کچھ نہ فاصلہ باقی

عجیب شہر تعصب میں آگیا ہوں میں
نہ کوئی چشم مروت نہ آشنا باقی

جنوں اسی کو ریاضی میں صفر کہتے ہیں
نہ ابتدا کا نشاں ہے نہ انتہا باقی

شاعری

# غزلیں

جمال اویسی

سلگتی دھوپ کی مانند بے قرار پھریں
لو لہان لٹے قلب زار زار پھریں

زمانہ کے تقدس کی کھاتا ہے قسمیں
جہاں میں ایک فقط ہم گناہ گار پھریں

کسی نے باندھ رکھا ہے طلسم میں اپنے
جدھر جدھر ہو اشارہ بے اختیار پھریں

ہجوم یاس ، کسک، آتشِ فگار و الم
کہ پابجولاں سجائے صلیب و دار پھریں

کہاں چھپی ہے خلوص و وفا کی اے دیوی
تری تلاش میں کب تک یہ دل فگار پھریں

جنون و شوق یہ تقلید مغربی توبہ!
کہ کرکے عصمت و عزت کو تار تار پھریں

زمانہ ہو گیا کھوئے شباب و رنگِ جمال
نظر میں اب بھی مگر وہ گل بہار پھریں

دور نظروں سے منظر سہانے ہوئے
ان کو دیکھے ہوئے تو زمانے ہوئے

پہلے جیسی نہیں قیمت و منزلت
ان کی محفل میں اب ہم پرانے ہوئے

دوستی کر لیے ہم بھی صحرا سے، جب
بند ہم پہ در بادہ خانے ہوئے

جاتا ہے مجھے آج خرد و کلاں
اتنے مشہور میرے فسانے ہوئے

گھٹ گیا اس قدر نرخِ انسانیت
قیمتِ خون اب چار آنے ہوئے

اے پرندوں تمہاری نہیں خیر اب
ہیں شکاری سبھی تیر تانے ہوے

اب اچھالے وہ سر کو یا دستار کو
اے جمال اس کے تو ہم دوانے ہوئے

# غزلیں

## شارق عدیل

آنکھوں میں بسے خواب مناسب تو نہیں تھے
مزدور تھے ہم شہہ کے مصاحب تو نہیں تھے

اے دشت نوردی کا صلہ بخشنے والے
ہم عشق میں اعزاز کے طالب تو نہیں تھے

کیا اس کے بیانات اترتے مرے دل میں
ہر چند کہ پر شوخ تھے جاذب تو نہیں تھے

پھر کیوں رہ بازار کو اس نے کیا مسدود
ہم لوگ خریدار تھے غاصب تو نہیں تھے

پھر کس لیے ٹھہراتا انھیں مورد الزام
برہم تھے مگر مجھ سے مخاطب تو نہیں تھے

اس شہر کے لوگوں پہ عذاب اس لیے آئے
ہر عیب سے شرمندہ تھے تائب تو نہیں تھے

کیوں غور سے پڑھتا یہ زمانہ ہمیں شارق
فنکارو سخن فہم تھے غالب تو نہیں تھے

ہم اپنے عزم کی تشہیر کر کے کیا کرتے
ہوا اداس تھی تنویر کر کے کیا کرتے

درون قلعہ ہمیں سازشوں کا خطرہ تھا
فصیل شہر کو تعمیر کر کے کیا کرتے

رہا نہ مشغلہ دار و رسن کی لذت کا
سو ہم حماقت تقصیر کر کے کیا کرتے

میں لفظ لفظ مزین ہوا تھا ذہنوں میں
تو لوگ پھر مجھے تحریر کر کے کیا کرتے

جو جستجو کو تغافل کا نام دیتا تھا
ہم اس کے خواب کو تعبیر کر کے کیا کرتے

ہمیں تو اپنی حویلی کی لاج رکھنی تھی
نئے مکان کو تعمیر کر کے کیا کرتے

حصول رزق سے فرصت نہ مل سکی شارقؔ
فراق لمحوں کو زنجیر کر کے کیا کرتے

# نئی نظمیں

رفیق جعفر

## زخمی منظر

پھول کے دامن پر
یہ آنسو کس کے ہیں
کوئی یہاں پر آیا ہوگا
پھول کو اس نے چوما ہوگا
ہاتھ بڑھا کر
کانٹوں سے بھی
الجھا ہوگا
لہو کی بوندیں ٹپکی ہوں گی
آہ بھی منہ سے نکلی ہوگی
نازک ٹہنی لرزی ہوگی
پھول کی سسکی سن کر
چونکا ہوگا
پھر سرپٹ دوڑا ہوگا
پھول کے دامن پر
یہ آنسو اس کے ہوں گے
جو کہ یقیناً
پریت کا متوالا ہوگا
پیاسا ہوگا

## سلگتا چاند

سلگتے چاند کی حدّت
قربت کے بعد
محسوس ہوئی تو
سانسوں کی چاندنی مسکائی
چاند کو شرم آئی
حدّت کی شدت سے
گھبرا کر میں دور ہوا
تو میرے اندر کا سورج
چپکے سے
میری آنکھوں سے جھانکا
اس کی کرنیں
جب چاند کی حدّت سے
ٹکرائیں تو جوالا پھوٹا
پھر رات ہوئی
تارے چمکے
صبح ہوئی تو ڈوب گئے

## پڑوسی کی لڑکی

پڑوسی کی لڑکی
بہت ہی حسیں تھی
کنواری ہنسی میں
بلا کی کشش تھی
خوشی تھی
بدائی میں اس کی
آنسو بہے تھے

O

ابھی تین مہینے بھی
گذرے نہیں تھے
کہ سسرال والوں سے
کہنے پر لڑکی
جہیز کا ''بقایا''
وصول کرنے
میکے میں آئی

O

حالت عجب تھی
تیور غضب تھے
پھول چہرہ مرجھا گیا تھا
بدن کے چمن پر
خزاں چھا گئی تھی

O

ہائے
پڑوسی کی لڑکی!

# نظمیں

نسیم محمد جان

## گوری لنکیش

کون کہتا ہے
تم نہیں ہو اب
جن لوگوں نے گولیاں چلائیں
سامنے آتے ہوئے ڈرتے ہیں
سچ بولنے کی قیمت چکائی ہے تم نے
ہمیشہ کی زندگی پائی ہے تم نے
انسانیت کے کچھ تقاضے ہیں
ان کو پورا کر دیا تم نے
وہ لوگ تو تاریکیوں میں گم ہو جائیں گے
دن کے اُجالے جو آ سکتے نہیں
خوف ان کی قسمت ہے
موت ان کا مقدر ہے
موت ان کا مقدر ہے
تم نے تو دائمی زندگی پائی
سچ تو خود ہی بولے گا
لاکھ گولیاں چلائے کوئی

## سزائیں کون دے گا

ایک توانا آدمی نے
کسی مزدور کمزور کو
بے رحمی سے مار ڈالا
غالباً صرف اس لیے
ماننے والا تھا دوسرے مذہب کا وہ
ممکن ہے چھوٹ جائے کہے
دماغی طور پر بیمار ہوں
سزا بھی مل سکتی ہے اسے
قاتل جو ہے
مگر ان کو کون روکے گا
سزائیں کون دے گا
جو دھرم کے نام پر ادھرم کرتے ہیں
انسانیت کا خون کرتے ہیں
نفرت جن کی تجارت ہے
وہ تو آزاد پھریں گے زہر کے پیالے لیے
دکانوں اور بازاروں میں
ٹی وی اور اخباروں میں
ان کو سزائیں کون دے گا
کون دے گا ان کو سزائیں
کوئی اور مل جائے گا
اس ظلم کو دہرانے کے لیے

نسیم بن آسی

افسانہ

# تحت الثریٰ

اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا لیا۔ وہ سگریٹ کا عادی نہیں تھا۔ کبھی کبھی جب وہ گھر سے باہر ہوتا، ایک یا دو سگریٹ پی لیا کرتا تھا۔ خاص طور سے کسی فکر یا تشویش کی حالت میں اس نے دائیں بائیں سر گھما کر دیکھا، ایک گہرا سناٹا ہر طرف پسرا پڑا تھا۔ وہ جب پہلی بار یہاں آیا، یہ نیا پل نہیں بنا تھا۔ اس کی جگہ ہلتا ڈولتا کمزور پل تھا۔ گلیاں بس اتنی بدلی تھیں، اینٹ کا کھڑنجہ ہٹا کر سیمنٹ کی سڑک بنا دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی گرمی کے دنوں کے جھونکے کھاتی دوپہر تھی۔ سڑک کے کنارے وہی مرجھاؤ اور اداس پیڑ۔ لوگ گھروں میں مقید ہو گئے تھے۔ وسیع و عریض دنیا کتنی مختصر ہو گئی تھی اور انسان کا تصور کتنا محدود..... شہر کے موسم کو جانے کیا ہو گیا تھا۔ ایسے بھی شہر میں موسم کہاں ہوتے ہیں۔ ان کا صرف ایک موسم ہوتا ہے جسے شہر کا موسم کہتے ہیں لیکن اب وہ بھی نہیں رہا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ بڑی سوئی ساڑھے تین پر کب سے رکی پڑی تھی۔ وقت اپنے پہیے پر آدھا رکا ہوا تھا۔ وہ حیران ہو گیا۔ جیسے وہ صدیوں سے سوتا رہا ہے جب کہ اس کی آنکھوں سے نیند کئی دنوں سے غائب تھی۔ وہ جانے کسی سفر پر گئی تھی۔

سڑک کے دونوں طرف میلوں سوکھی گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بیچ وہ چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ اس نے بے خیالی میں اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہاتھ میں پسینہ کی بوندیں لگ گئیں۔ ہر وقت بے چینی ٹینشن اور گھٹن سے ابھری تصویر..... وقت کتنا بڑا مصور ہے۔ وہ زندہ جسم پر اپنے دل کی مصوری کتنے عجیب انداز سے کرتا ہے۔ اس کا روشن چہرہ دن بھر کی گرد و غبار آسمان میں جمع ہونے سے دھندلا گیا تھا۔ اس پر بھی سورج کی تمازت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا، وہ زندہ تو ہے لیکن اس میں روح نہیں ہے۔ اس نے کرتے کی جیب سے رومال نکالا اور جو گرد چہرہ پر جم گئی تھی، اسے صاف کیا تبھی اسے اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ پانی کے لیے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے کچھ فاصلہ پر ایک نل نظر آیا۔ اس میں سے پانی سوں سوں کر کے نکل رہا تھا جیسے کوئی بکرا ذبح کیا جا رہا ہو..... کچھ دیر بعد ایک جھٹکے کے ساتھ نل کے منہ سے پانی کی تیز دھار آنے لگی۔ اس نے ہاتھ کا چلو بنا کر پانی کو حلق کے نیچے اتارا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور پورے جسم میں تراوت آ گئی۔

گھر آنے پر دروازہ کے پاس کھڑی بیوی کا وہی متفکر چہرہ نظر آیا جو بھیڑیوں کے خوف سے اپنی اصلیت کھو چکا تھا۔ بچے اسکول سے واپس نہیں لوٹے تھے۔ اسے اندیشہ تھا، کہیں راستہ میں.....

صرف بڑی لڑکی گھر میں تھی جو تعلیم مکمل کرنے کے بعد گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی تھی۔ اس کے جسمانی خدوخال بہت جلد اپنے حدود کو تجاوز کر کے گہرے ہو گئے تھے اور اپنے ہونے کا علان کر رہے تھے۔ بالوں کو جانے کون سا وٹامن مل گیا تھا، وہ کمر تک لٹکتے رہتے تھے۔ سب سے زیادہ اختلاف اس کے رنگ کے بارے میں تھا جس کا فیصلہ مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں تھا۔ گورا، کالا، یا سانولا رنگ، ان تینوں میں سے کوئی بھی تو رنگ نہیں تھا۔ شاید کوئی چوتھا رنگ تھا جس کا ابھی کوئی نام نہیں پڑا تھا لیکن سہولت

کے لیے اسے صبح کا ذب کے بعد کا رنگ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ جس میں اجالوں کا ہالہ آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے اور کچھ ہی لمحوں میں وہ ساری کائنات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

اس کے باپ ایک کرانہ کی دکان میں کام کرتے تھے۔ دکان لمبی لیکن چوڑی کم تھی۔ سامنے کا حصہ جہاں مالک خود بیٹھتا تھا، کچھ صاف ستھرا دکھائی دیتا تھا۔ دکان کے پیچھے والے حصہ میں ایک چھوٹا گودام تھا۔ اس کے باپ کا کام اس حصے میں سامان تلاش کر کے سامنے والے حصے میں لانا تھا۔ گودام میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ جو بھی روشنی تھی، پندرہ واٹ کے ایک بلب کی تھی۔ آٹے دال کی بوریوں سے لے کر جھاڑو، صابن اور تیل کے کنستروں سے بھرے اس کمرے میں اجالا اتنا کم تھا کہ اپنے باپ کو یاد کرنا اسے فضول معلوم ہوتا تھا۔ اس کے باپ کڑ قدامت پسند تھے اور وہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کا دیوانہ تھا۔ وہ جانتا تھا۔ ایک غریب کا بیٹا ہوتے ہوئے خواہشوں کے آسمان میں وہ زیادہ بلندی تک نہیں اڑ سکتا ہے لیکن اڑنا اس کے مزاج میں تھا جس رات پہلی بار اسے ایک بھیڑئے کی آواز سنائی دی، وہ کچھ لمحوں کے لیے ٹھٹھکا ضرور لیکن اس کے بعد وہ اس کی شکل اور جسامت کی تصویر بنانے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں چمکیلی ہوں گی۔ اس کا منہ کتوں جیسا ہوگا۔ وہ بہت شاطر اور چالاک ہوگا وغیرہ۔

اس نے کمرہ میں موجود چیزوں پر نظر ڈالی۔ دیوار پر جو کیلینڈر لٹک رہا تھا، اس میں گاندھی کی آنکھوں کا حصہ پھٹ گیا تھا۔ اسے گرمی کا احساس ہوا۔ کچھ موسم کا اثر تھا، کچھ ماحول کا۔ بیوی نے اٹھ کر سوئچ آن کر دیا لیکن ہر دن کی طرح آج بھی بجلی غائب تھی۔ کچھ ہی دیر میں بڑی لڑکی نے کھانا سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس نے کھانا کو دور کی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ خود اسے کھانے کے لیے دوڑ رہا ہو۔ پیٹ میں کچھ نہ ہونے کے باوجود بھوک ندارد تھی۔ اس پر بھی اس نے چند نوالے بے دلی سے شکم کے اندر اتارے اور پانی پی کر ایک لمبی ڈکار لی جیسے ضرورت سے زیادہ کھا لیا ہو۔ کھانا کھانے کے بعد وہ بیوی کو بغیر بتائے باہر نکل گیا۔

اس کے دماغ میں وہی بھیڑیوں والی بات تھی جس سے وہ نجات نہیں پا رہا تھا۔ وہ سکون کے لیے ایک چائے خانہ میں داخل ہو گیا۔ اس میں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے جو آفس کے کام سے تھک کر دوپہر کے وقت چائے خانہ میں پناہ لینے چلے آئے تھے۔ تنخواہ کے علاوہ اوپری یافت ہونے سے ان کی جیبوں میں ہر وقت خارش ہوتی رہتی تھی اور جب تک وہ انڈوں، بالائی اور ٹوسٹ سے شکم پر نہیں کر لیتے تھے، انہیں تسلی نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت وہ خورد و نوش کے بعد اخبار بینی میں مصروف تھے اور حالات حاضرہ پر اپنی بساط کے مطابق تبصرہ کر رہے تھے۔ تبھی کوئی آٹھ سال کا چھوکرا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چائے کا آرڈر دیا۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے خیالوں میں غرق ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں بھیڑئے اپنے پورے وجود کے ساتھ چل پھر رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد چائے آ گئی۔ اس نے چائے پیتے ہوئے آفس کے بابوؤں پر ایک نظر ڈالی۔

سر! آپ لوگ ان بھیڑیوں کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے جن کی وجہ سے زندگی اجیرن ہو گئی ہے اور جینا محال ہو گیا ہے۔؟

کسی کی زندگی کا ہم لوگوں نے ''ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا؟ بڑے بابو سے اس طرح دوٹوک فیصلہ سن کر وہ عجیب نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

لیکن سر! انسانیت کے ناطے کچھ آپ لوگوں کا بھی

فرض ہوتا ہے وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بڑے بابو نے درمیان ہی میں بات کاٹ دی۔

''تم مجھے فرض کے بارے میں سکھا رہے ہو؟ اس سرکاری نوکری میں فرض شناسی کرتے پوری عمر گزر گئی''۔

آپ لوگ کتنا فرض شناس ہیں، معلوم ہے''۔

اپ چائے خانہ میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

راستے کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے وہ ایک جگہ رک گیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کس طرف جا رہا ہے؟ اسے اپنی بے خبری کا احساس ہوا۔ تبھی اس کے ضمیر نے احتجاج کیا۔ نہیں وہ صحیح سمت جا رہا ہے۔

اس دن آدھی رات ہو چکی تھی۔ اسی وقت بھیڑیا بولنے لگا تھا۔ اس کی آوازیں ایسی خود اعتمادی تھی، جیسی اس نے خود اپنے اندر کبھی محسوس نہیں کی۔ وہ پوری طاقت لگا کر محنت کر رہا تھا۔ اس کی آواز آدھی رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ تکیہ سے سر اٹھا کر بغیر پلک جھپکائے اس کی آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اٹھا اور بند دروازہ کو زور سے پیٹنے لگا۔ پھر اسے خیال آیا، مکان کے اوپر والے کمرہ میں رہنے والا باقر سوچے گا، وہ اسے بلا رہا ہے۔ وہ اس کی واہیات باتوں اور تازہ شعر سننے کی ضد سے بہت جلد پریشان ہو جاتا تھا۔ اس نے سوچا، دروازہ پیٹنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اسے کوئی اور علاج کرنا چاہیے۔ کچھ دیر بعد بھیڑیئے کی آواز اپنے آپ بند ہوگئی۔ اس نے اپنی پیشانی پر پسینے کی بوندیں محسوس کیں۔ اس نے سانس روکے کئی لمحہ انتظار کیا لیکن بھیڑیا ایک دم چپ تھا۔

وہ گلی سے ہو کر ہجوم بھرے سڑک پر آ گیا۔ ٹریفک کی آمد و رفت حسبِ معمول جاری تھی۔ وہ سڑک پار کر کے ایک ریستوران کی طرف مڑ گیا جہاں شہر کے دانشور، سیاست داں، راست باز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اکثر شام کو آ کر اس کی رونق میں اضافہ کرتے تھے۔ یہ شہر کا سب سے خوب صورت اور عالی شان ریستوران تھا۔ ریستوران کی کھڑکیاں پتلے شیشے کی بنی تھیں۔ ان سے باہر کا شور اندر آ جاتا تھا۔ شہر کے کئی مشہور غنڈے کاروں اور موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر اپنے دوستوں کے ساتھ دیر رات تک آتے رہتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ ملٹری کینٹین سے سستے دام میں خریدی گئی شراب کی بوتلیں لاتے تھے۔

وہ زینے چڑھتا ہوا اوپر کی منزل پر چلا گیا۔ اس کی نگاہ کھڑکی کے شیشے پر گئی۔ وہ زور سے دھڑک رہا تھا۔ شراب کی پارٹی والے کمرے میں راک میوزک کا زلزلہ آ گیا تھا۔ ہنسنے اور چلانے کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھی۔ ان میں مردوں کی آوازیں تھیں اور عورتوں کی بھی۔ جس کمرے میں پارٹی چل رہی تھی، وہ پروفیسر گیلانی کا کمرہ تھا۔ وہ دراز قد کے انسان تھے۔ اور انگریزی ان کی خلیری زبان تھی۔ وہ یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے تھے۔

کرسیوں پر نیم دراز بے فکر سے لوگ سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔ اور دھوئیں کے مرغولے بنا کر فضا میں اچھال رہے تھے۔ چائے اور کافی کا دور چل رہا تھا۔ ان کی مدہوش کن خوشبو سارے ہال میں پھیل رہی تھی۔ فکر کے بوجھ سے آزاد لوگ ٹیپ ریکارڈ کے مدھم اور دل نواز نغموں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اس نے جیسے ہی اپنی بات کا آغاز کیا قہقہوں اور ہنسی مذاق کا شور بلند ہو گیا۔ اس نے اپنی آواز ذرا اونچی کرنی چاہی لیکن اس کی آواز میں کوئی ریت چلی آئی۔ کچھ دیر بعد اس کے ہونٹ کچھ کہنے اور نہیں کہنے کے درمیان تھرتھرائے جیسے وہ اب بھی طے نہیں کر پا رہا ہو، وہ ان سے کچھ کہے یا نہیں.... اسی وقت ریستوران کا مالک آ گیا۔ وہ بے وقت بوڑھا دکھائی دینے والا آدمی تھا۔ چترا ٹاکیز کی بغل سے نکلنے

والی گلی میں وہ ایک عالی شان عمارت میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتا تھا۔اس سے اس کی ملاقات اس وقت ہوئی تھی، جب وہ پیشاب کرنے کے لیے گلی میں مناسب جگہ تلاش کررہا تھا۔

سر! آپ لوگ کبھی ان بھیڑیوں کے بارے میں بھی.... ریستوران کا مالک جو داڑھی مونچھ سے صفاچٹ تھا، کرسی سے اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا.....

یہ ریستوران ہے، پتہ ہے....؟

دن کا اجالا دھیرے دھیرے معدوم ہورہا تھا۔آسمان میں کوؤں اور دوسرے پرندوں کا غول بے ہنگم شور کے ساتھ غیر متعین سمت کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ابابیلیں قطار در قطار اڑتی ہوئی خلاء کو سیاہ دھبوں میں تبدیل کررہی تھیں۔

اس کی باہری ہیت جانے کیسی ہوتی جارہی تھی۔اس کے اندر عجیب توڑ پھوڑ ہونے لگی۔وہ اپنے آپ سے مسلسل لڑتے ہوئے جانے کہاں آ گیا تھا۔کیا اس نے اپنے آپ اپنی حالت بگاڑ لی ہے اور جو کچھ وہ کررہا ہے، وہ قابل استہزہ ہے..... ڈاکٹر، انجینئر، سیاست داں، راست باز اور مس ورلڈ کیا صرف نام ہیں؟

تبھی اس کی نگاہ ایک کھلے دروازے پر پڑی۔اس کے اندر ایک آدی لکڑی کی کرسی بنارہا تھا۔اس نے ایک لمحہ رک کر دروازہ کے اندر نظر ڈالی۔اس میں دو کرسیاں پہلے سے بنا کر رکھی ہوئی تھیں۔کرسی بنانے والے نے اسے اپنا نام رحمان بتایا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا، وہ بنگلہ دیش سے آیا ہے۔مہاجر ہے یہاں کا شہری بننے میں اسے بیس سال لگ گئے۔ان سالوں میں وہ کئی شہروں میں بھٹکا تھا۔لکڑی کی کرسی خریدنے کے لیے اسے یقین دہانی کراتے وقت اس نے اپنے بارے میں تفصیل سے بتانے کی کوشش کی لیکن اس کی زبان بیچ میں لڑکھرا جاتی تھی۔شاید اسے پیدائشی مرض تھا یا زیادہ گٹکا استعمال کرنے سے اس کے بولنے کی صلاحیت چلی گئی تھی۔اس کی آنکھوں میں طویل عرصے تک جھیلی گئی غریبی کی نشانی موجود تھی۔لکڑی کی دستکاری اس کا آبائی پیشہ تھا لیکن اس پیشے سے پیٹ پالنا اس کے لیے مشکل ہوگیا تھا۔اس کے باجود اس نے کرسی خریدتے وقت مول تول کی کوشش کی تھی۔جب کہ اسے مول تول کرنے نہیں آتا تھا۔پھر بھی وہ کوشش کرتا تھا۔شاید اسے لوگ للو نہ سمجھ لیں۔اس نے کرسی کی قیمت ڈیڑھ سو روپے بتائی تھی لیکن اس کی جیب میں صرف چالیس روپئے تھے۔

آسمان چیل کوؤں کے شور سے بھر گیا۔کتنی عجیب بات تھی، جو شہر کبھی امن وامان کا گہوارہ تھا، وہ صرف بھیڑیوں کی وجہ سے آفت زدہ ہوگیا تھا۔

اس کے دماغ میں خیالات کے ہجوم ایک دوسرے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہونے لگے۔کیا وہ اپنی کوششیں ترک کردے لیکن اس طرح بھیڑیوں کے پاؤں اور بھی مستحکم ہوجائیں گے۔

اس کے دل کے اندر راکھ کی پرتوں کو ہٹا کر انگڑائی لیتا ہوا کوئی پیکر اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ بھیڑیوں کو میدان چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھنے لگا۔لہروں میں ارتعاش تھا اور وہ خیالات کے سیلاب میں کشتی پر اکیلا سوار ہلتا ڈولتا چلا جارہا تھا۔

لیکن اب اسے جانا کہاں ہے۔اپنے گھر ہی تو۔جہاں اس کی بیوی اور بچے اس کا انتظار کررہے ہوں گے۔اسی وقت اس کے تخیل کی پریاں آسمان سے اتر آئیں۔وہ گھر جا کر اپنی بیوی سے کہے گا، دیکھو میں آسمان کی بلندیوں کو چھوسکتا ہوں۔پھولوں کی خوشبو اپنی جیبوں میں بھر سکتا ہوں۔اور پہاڑوں کی گنگنی دھوپ تمہارے آنگن میں اُتار سکتا ہوں۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر کے سامنے تھا۔کمرے کا

دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر بیوی پر پڑی۔ وہ ٹھٹھک کر دروازہ پر رک گیا۔ اس کی بیوی کا سر ایک طرف لڑھکا ہوا تھا اور اس کی ایک بانہہ پلنگ کے نیچے جھول رہی تھی۔ اس کی گردن سے خون نکل کر فرش پر پھیل گیا تھا۔ وہ سرعت کے ساتھ کچن میں چلا گیا۔ بڑی لڑکی فرش پر خون آلودہ پڑی تھی۔ صحن میں ہینڈ کل کے پاس تینوں بچے پانی کے ٹب میں ایک ساتھ اوندھے منہ گرے ہوئے تھے۔

وہ کئی منٹ وہاں گم صم کھڑا تھا پھر وہ خود سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے دھیرے سے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ اس پر بھی وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سے ان گنت سوال کر رہے تھے پھر وہ اپنی بیوی کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر ایک دوست کی طرح ہاتھ رکھ دیا۔ دیکھو، میں آ گیا ہوں۔ تم انتظار کر رہی تھی نا؟

اس کا شعور آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا..... اب اسے اچھی طرح یاد نہیں تھا، اس طرح کا حادثہ اس کی زندگی میں کب ہوا تھا۔ ہوا بھی تھا یا نہیں لیکن واقعات اپنے کو دہرانے لگے تھے۔ سورج دوسری طرف پیڑوں کے اوپر چڑھ آیا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس نے چہرہ گھما کر سامنے دیکھا۔ چاروں طرف شہر پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف کئی منزلہ عمارتیں تھیں۔ اور ان کا گھنا پن تھا۔ پیڑوں اور عمارتوں کے پیچھے پہاڑوں کی قطاریں تھیں جن کا نیلا رنگ ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ اس کا شور سمٹنے لگا۔ ہلکے اندھیروں کی عمیق کوکھ سے خاموشیاں سر نکالنے لگیں۔ اس نے بوسیدہ دیواروں سے کان لگا کر ان کی آوازوں کو سننے کی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔


بیگ احساس

کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔ ۹۵

محبوب پاشاہ اعظمی

افسانہ

# تصویر ہمارے سامنے ہے

بھائی صاحب نے رات فون پر بتایا تھا جاوید صبح ممبئی پہنچ رہا ہے اور اسے ریسیو کرنے اسٹیشن پہنچنا۔ جاوید میرے بھائی کا سب سے چھوٹا لڑکا ہے۔ جاوید سے پہلے بھائی صاحب کو ایک کے بعد ایک تین لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں بھائی صاحب گریجویٹ تھے مگر کوئی اچھی نوکری حاصل نہیں کی، وجہ یہ تھی کہ وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر باہر جانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے میونسپالٹی کی نوکری سے وہ خوش تھے۔ سیدھی سادھی زندگی، کم تنخواہ میں بھی کام چل جاتا تھا۔ بھای صاحب نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ دینی تعلیم اور قرآن پاک بچیاں پڑھی ہوئی تھیں اور میونسپل اسکول میں آٹھویں تک پڑھائی تھی اس لیے آٹھویں تک پڑھائی کے بعد گھریلو کام کاج میں لگ گئی تھیں۔ بھائی صاحب نے اپنے لڑکے کی تعلیم پر بہت توجہ دی تھی اسے کالج میں داخل کروایا تھا اور بھائی صاحب کی کم تنخواہ میں جاوید کی کالج کے اخراجات مشکل سے پورے ہو جاتے تھے۔ خدا خدا کر کے کسی طرح جاوید گریجویٹ ہوا تو بھائی صاحب نے اپنی بیٹی کی نند سے جاوید کا نکاح کر دیا اور وہ جاب کی تلاش میں ممبئی آ رہا تھا۔ بھائی صاحب نے رشتہ داروں میں اپنے گاوں میں تینوں بیٹیوں کی شادی کر دی تھی۔ تینوں بیٹیوں کی سسرال ان کے گاؤں میں ہی تھی۔ بڑی بیٹی کی سسرال بھائی صاحب کے گھر سے کوئی دور نہیں اسی محلّہ میں تھی، دوسری اور تیسری کی سسرال بھی پاس پاس تھیں اس لیے کوئی بھی ایمرجنسی ہو دس پندرہ منٹوں میں سب اکٹھا ہو جاتے تھے، ایک دوسرے کی خیر خیریت ہو جاتی، مدد ہوتی۔ بھائی صاحب کو اپنی تین لڑکیوں کی شادی کا کوئی ٹینشن نہیں ہوا تھا۔ جیسے ہی بڑی لڑکی جوان ہوئی اپنی خالہ کے لڑکے جس کی ریڈی میٹ کپڑوں کی شاپ تھی اس سے شادی ہوئی دوسری لڑکی بھی رشتہ میں بیاہی گئی جس کا شوہر میونسپل اسکول میں ٹیچر تھا اور تیسری لڑکی کا خاوند دوبئی میں کام کرتا تھا۔

خواہشات کے پاوں چادر سے باہر نکل جائیں تو پھر سکون نصیب نہیں ہوتا۔ سوچیں بوڑھا کر دیتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ اپنی ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی میں اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کر دینا چاہتا تھا، اور میری پریشانی بڑھتی ہی جا رہی تھی کیوں کہ کوئی مناسب لڑکے نہیں مل رہے تھے۔ بیوی بھی الگ سے پریشان بھی کیسے ان دو بیٹیوں کو ٹھکانے لگا دیں! ہمارے گاوں میں رشتہ دار تھے ان میں کوئی قابل لڑکے نہیں تھے، وہ پڑھے لکھے تو تھے مگر گاوں میں ہی چھوٹی موٹی نوکریاں کرتے تھے۔ میری دونوں لڑکیاں B.E. کر چکی تھی۔ بڑی لڑکی نے MBA بھی کیا تھا اور نہ ماننے کے باوجود اس نے ایک MNC میں جاب کرنے لگی تھی دوسری لڑکی کا حال بھی اس سے الگ نہیں تھا، اس نے پوسٹ گریجویشن کیا اور اپنی ہی کالج میں لکچرر ہو گئی تھی، مطلب یہ کہ دونوں لڑکیاں کمانے لگی تھیں۔ دونوں کی تنخواہ کل ملا کر ایک لاکھ روپئے سے زائد ماہانہ ہو جاتی تھی۔ میرا اور بیوی کا خیال تھا۔ لڑکیوں کی تنخواہ سے کچھ کم یا زیادہ کمانے والے داماد ملے۔ روز ٹینشن بڑھ رہا تھا۔ بیوی کو BP اور شوگر کی شکایت تھی۔ میرا یہ حال تھا کہ کہ صحت مند ہو کر بھی بیمار بیمار نظر آنے لگا تھا۔ ہر وقت یہ فکر لاحق ہوتی تھی کہ کسی طرح ان دو لڑکیوں کی شادی ہو؟ ممبئی میں اپنے جان پہچان کے یار دوستوں کو اپنی لڑکیوں کا Bio-Data دیا ہوا تھا۔ شادی ڈاٹ کام انٹرنٹ میں بھی دونوں لڑکیوں کا

Profile تھا۔مگر کہیں سے کوئی قابل رشتہ نہیں مل رہا تھا۔ہم دونوں میاں بیوی کافی پریشان تھے۔ٹینشن ایسا تھا کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

بھائی صاحب کو بھی بتا دیا تھا ان کی نظر میں دوست احباب میں کوئی قابل ومناسب لڑکے ہوتو بتائیں۔ بھائی صاحب بھی اپنے طور پر کوشش میں لگے ہوئے تھے۔اور ہر بار تاکید کرتے کہ رشتہ داروں سے تعلقات جوڑے رکھو، پتہ نہیں کب کون کام آجائے۔ میں اور میری فیملی ممبئ کی لائف کے عادی ہو چکے تھے۔گاوں کی زندگی سے کوسوں دور۔گاوں میں شہر کی سہولتیں کہاں؟ پانی بجلی کا مسئلہ، پانی ایک دن آتا اور پھر تیسرے دن بعد۔بجلی کا بھروسہ نہیں کب آئی اور کب گئی کھانے پینے کا الگ پرابلم۔رہنے کا کوئی خاص انتظام نہیں۔گاوں میں ہمارا دم گھٹتا تھا اس لیے ہم لوگ ایک دو دن سے زیادہ گاوں نہیں ٹھہرتے تھے۔اور جب لڑکیاں جوان ہونے لگی اوران کی پڑھائی تھی اس لیے پچھلے کئی سالوں سے گاوں جانا نصیب نہیں ہوا تھا۔گاوں سے تعلق کٹ گیا تھا۔دوست واحباب رشتہ دار دور ہوتے گئے اور ہم لوگوں نے انہیں بھلا ہی دیا تھا۔لے دے کہ بڑے بھائی صاحب تھے وہ اپنی مٹی سے جڑے رہے اس لیے ان کی زندگی ٹینشن فری ہے۔ایک نہیں تین تین بیٹیوں کے باپ ہوکر بھی انہیں کسی قسم کا ٹینشن نہیں تھا۔ ایسے ماں باپ جن کی تین بیٹیاں ہو۔رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے مگر بھائی صاحب نے اپنی کم تنخواہ میں میونسپالٹی کی نوکری میں اپنی تینوں لڑکیوں کی شادی بغیر کسی پریشانی کے اپنی حیثیت کے مطابق کر دی تھی۔

ایک میں ہوں ریٹائر ہونے والا ہوں۔لڑکیاں کب کی جوان ہوچکی ہیں بڑی چھبیس سال کی ہوگئی اور چھوٹی چوبیس سال کی۔دونوں کی شادی کی عمر پار ہورہی ہے۔یہ سوچ سوچ کر ہم دنوں میاں بیوی کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔رشتے لگانے والے ایجنٹوں کے پیچھے بھی کافی روپیہ ضائع ہوا مگر کچھ کام نہیں بنا۔ اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار بھی دیا گیا مگر کچھ نہیں ہوا!

میں نے پرانی ڈائری سے اپنے پرانے دوستوں کے کانٹیکٹ نمبر ڈھونڈ نکالے اوران کو کانٹیکٹ کیا اس نیت سے کہ کوئی قابل رشتہ میری بیٹیوں کے لیے مل جائے۔امید نہیں تھی مگر میں نے کوشش کی۔سلیم شیخ کو فون کیا.....

''ہیلو۔سلیم بھائی! کیسے ہو؟ کون.....؟

پاشا بول رہا ہوں۔کیسے ہو؟

بہت دنوں بعد یاد کیا! کہو کیا کام ہے؟

سلیم بھائی بس یوں ہی پرانے دوستوں کی یاد آ گئی

زندہ رہنے کے بہانے ڈھونڈیں

آو کچھ دوست پرانے ڈھونڈیں

آپ کا نمبر ملا ہے، ویسے ایک ضروری بات کرنی ہے۔

کہو پاشا..... کیا بات کرنی ہے؟ سلیم بھائی میرے اچھے دوست ہیں ہم نے برسوں ایک ساتھ کام کیا۔سلیم بھائی نے Voluntary Retirement لے لیا تھا صرف اس وجہ سے کہ ریٹائرمنٹ سے روپے مل جائیں گے اپنی بیٹی کی شادی ایک اچھی جگہ کھاتے پیتے خاندان میں کر دیں گے۔خوش قسمتی سے انہیں اچھا داماد مل گیا تھا۔دونوں میاں بیوی حج کر آئے اللہ کا شکر یہ ادا کیا۔ سلیم بھائی کو اپنی پریشانی کیسے بتاؤں یہ میں سوچ رہا تھا، سلیم بھائی کہنے لگے۔

''پاشا صاحب بولو کیا بات کرنی ہے؟''

''سلیم بھائی کوئی لائق لڑکے ہوتو بتاؤ میری بیٹیوں کے لیے''۔سلیم بھائی میں نے اپنی دونوں لڑکیوں کا پورا بیوڈاٹا بتا دیا۔ سلیم بھائی کہنے لگے .....پاشا! تمہاری لڑکیوں کی 26 اور 24 سال عمر ہو چکی ہے اب تک تو ان کی شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ بہت

لیٹ کر دیا آپ نے۔ فوراً شادی ہونی چاہیے ۔ عمر بڑھ رہی ہے30-28 سال میں رشتہ ملنا بہت مشکل ہے۔ سلیم صاحب نے تو میری پریشانی میں اور اضافہ کر دیا..... ''مسئلہ کچھ ایسا ہے کیا کروں سلیم بھائی کوئی قابل لڑکے ملے تو بات بنے۔ اس کوشش میں رات دن لگا ہوں اگر کوئی کامیابی نظر نہیں آتی''۔ میرے یہ درد بھرے الفاظ سن کر سلیم بھائی کہنے لگے۔

پاشا! تم ایک کام کرو۔ اپنا دوست انور ناٹیکر سے بات کیوں نہیں کرتے۔ اس کے کانٹیکٹ کافی وسیع ہیں۔

''میرے پاس ناٹیکر کا نمبر نہیں تھا اس لیے میں نے اسے کانٹیکٹ نہیں کیا۔'' سلیم بھائی سے انور ناٹیکر کا نمبر لینے کے بعد میں نے ناٹیکر کو فون کیا۔

ہیلو! ناٹیکر! کیسے ہو؟

کون .....؟

پاشا، تمھارے سرویس کے دنوں کا ساتھی!

ہاں ..... کہو کیسے یاد کیا؟ کیسے گذر رہی ہے! کیا ریٹائر ہو چکے ہو؟ یا ابھی سرویس میں ہو۔ کہاں سٹیل ہونے کا پلان ہے ریٹائرمنٹ کے بعد۔ تمھاری لڑکیاں کیا کر رہی ہیں ان کی شادی ہو چکی یا کرنی ہے۔'' انور ناٹیکر کے بغیر ایک سانس میں سب کچھ پوچھ لیا۔

ناٹیکر! ''لڑکیوں کی شادی کے لیے ہی تمہیں کانٹیکٹ کیا ہوں۔ کوئی قابل مناسب رشتہ تمھاری نظر میں ہے؟ بتاو اپنی قوم میں اچھے پڑھے لکھے لڑکوں کا قحط ہے!''

انور ناٹیکر میرا پرانا دوست۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ تقریباً آٹھ سال کام کیا تھا۔ ناٹیکر کا تعلق مہاراشٹرا کے کوکن علاقے سے تھا۔ اس کی تین لڑکیاں تھیں۔ پہلی لڑکی کی شادی کے بارے میں مجھے معلوم تھا کس خوبی سے کس پلاننگ سے اس کے سسر مرحوم نے یہ کارِ خیر انجام دیا تھا۔ ناٹیکر کی بیٹی جب جوان ہوئی اس کے نانا نے اپنے دوست انعامدار کے لڑکے کو پچاس ہزار روپے میں نوکری پرمٹ اور دوبئ کے ویزا کا انتظام کر دیا تھا۔ انعام دار غریب تھے صوم وصلوٰۃ کے پابند۔ ناٹیکر کے سسر اور انعام دار بچپن کے دوست تھ دوستی رشتہ داری میں بدل گئی۔ میں شادی میں گیا ہوا تھا۔ اچھی طرح یاد ہے انعام دار کے لڑکے اور ناٹیکر کی لڑکی کا نکاح مسجد میں ہوا تھا اور نکاح کے بعد دوسرے دن انعام دار فیملی اور ناٹیکر فیملی نے ولیمہ رکھا تو کوئی بڑی دعوت کا انتظام نہیں کیا تھا، انعام دار فیملی اور ناٹیکر فیملی مل کر اپنے اپنے گھروں سے پکوان لائے تھے۔

ناٹیکر..... کہو؟ تمھاری بھی تو تین لڑکیاں تھیں، پہلی کی شادی کے بارے میں مجھے معلوم ہے، باقی دو کی شادی ہوئی کیا؟

کیا کروں پاشا بھائی میں بھی تمھاری طرح پریشان ہوں۔ اپنی برادری میں کوئی ڈھنگ کے لڑکے نہیں مل رہے ہیں۔ بچیوں کی عمریں بڑھ رہی ہیں۔ اس غم میں میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے! میں اب اکیلا ہوں۔ اپنے گاوں کے لوگوں سے میرا کوئی کانٹیکٹ ہی نہیں ہے کہ انہیں بتاؤں کہ مجھے اچھے پڑھے لکھے داماد کی تلاش ہے۔ کوئی تو مدد کرتا۔ کیا کروں، برسوں ہوئے گاوں گئے ہوئے! اپنے رشتہ داروں سے ملے ہوئے۔ میری لڑکیاں ممبئ میں پیدا ہوئیں تعلیم یہاں پائی۔ اب گاوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر گاوں میں کوئی قابل لڑکا مل جائے تو شادی نہیں کریں گی کیوں کہ ان کو گاوں کے لڑکے پسند نہیں ہیں اب آپ ہی بتاو پاشا بھائی میں کیا کروں؟ آپ کی میری پرابلم ایک ہی ہے! اپنے مسلم معاشرے میں لڑکیاں تعلیم کے میدان میں آگے ہوگئی ہیں اور لڑکے پیچھے رہ گئے ہیں! لڑکیاں اچھی جابس پر ہیں اور لڑکے نوکری کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ جن کے گھر دو چار لڑکیاں ہوں وہ کیا

کریں؟ لڑکی گریجویٹ ہوئی شادی ہوچکی ٹھیک ہے۔ اگر شادی نہ ہوئی تو گھر میں بیٹھی بور ہونے لگی اس لیے آگے تعلیم کے لیے پوسٹ گریجویٹ، ایم۔فل، پی ایچ ڈی نہ جانے کیا کیا ڈھیر ساری ڈگریوں سے ماں باپ کی فکریں بڑھ رہی ہیں۔ اتنی ڈگریوں والی پڑھی لکھی لڑکی کے لیے رشتہ ملنا بہت مشکل ہے۔ کیا کریں پاشا بھائی آپ ہی بتاؤ! وقت پر شادی نہ ہوئی تو مسلم لڑکیاں غیر قوم کے لڑکوں کے ساتھ شادی ماں باپ کی اجازت کے بغیر کرنے لگی ہیں۔

انور بھائی اس کا حل کیا ہے؟

کچھ نہیں! بس آنکھیں بند رکھو.... اگر تمھیں یہ سب دیکھنا نہیں ہے تو.....!

لیکن انور بھائی ایسا معاشرے میں نہیں ہو رہا ہے۔ غیر مسلم سماج بھی اس کا شکار ہے۔ گاوں سے نوکری کے لیے آ کر بڑے شہر میں سیٹل ہو گئے اور کسی طرح جدو جہد کر کے ممبئی میں مٹروسٹی میں ایک ادھ فلیٹ خریدنے میں اپنی زندگی بھر کی خون پسینے کی کمائی لگا دی اور اپنے بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر بنانے میں اپنے گاؤں اپنے رشتہ داروں سے اپنی مٹی سے رشتہ توڑ لیا۔ گلوبالائزیشن جس نے زندگی گزارنے کے تمام روایتی انداز بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ انٹرنیٹ کا شکار، یم ین سی کی یلغار ردی لیف آئی کا حملہ اور ہماری نئی نسل اسکا شکار ہوئی ہے! ہمارے رشتوں میں ایک نہ معلوم خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ ہماری فیملی لائف بالکل بدل گئی ہے ہم بوڑھے ہو چکے ہیں اپنی ذمہ داریوں کا حساس ہے جو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ فکرمند ہیں اپنی اولاد کی شادی ہو ان کی اپنی فیملی ہو۔

انور ناٹیکر کہنے لگا۔ سب کی ایک ہی کہانی ہے۔

ہاں انور بھائی..... بلا امتیاز مذہب وملت ہم لوگوں کی ایک ہی کہانی ہے میں اپنے غیر مسلم ساتھیوں کو جانتا ہوں۔ وہ بھی اپنے بچوں کی شادیوں کو لے کر کافی ٹینشن میں ہیں میرے ہی بلڈنگ میں میرے غیر مسلم دوست ہیں جنہیں میں قریب سے جانتا ہوں۔ اور انور بھائی آپ کو معلوم ہے اپنے سرویس کے دنوں کے ساتھی سدھارتھ لوکھنڈے، رمیش پوجاری، روی شنکر؟

ہاں پتہ ہے، یہ آپ ہی کے بلاک میں رہتے ہیں۔ اعجاز صدیقی صاحب بھی تو آپ ہی کے بلڈنگ میں ہیں؟ سناوان سب کی کیا داستان ہے؟

انور ناٹیکر کے پوچھنے پر میں اپنی بلڈنگ کے ساتھیوں کے بارے میں بتانے لگا جو ہماری طرح کے حالات سے دو چار ہیں۔ سدھارتھ لوکھنڈے کی ایک ہی بیٹی تھی MBBS کر چکی تھی، سدھارتھ شیڈول کاسٹ تھا ور کوئی S T لڑکا نہیں مل رہا تھا۔ سدھارتھ نے اپنی بیٹی کے لیے لڑکا ڈھونڈنے میں زمین آسمان ایک کر دیا۔ مگر کیا ہوا؟ اس کی لڑکی ایک عیسائی لڑکا جو ڈاکٹر تھا اس کے ساتھ بھاگ کر شادی کر لی۔

یہ اچھا نہیں ہوا۔

انور سنو! انور بھائی، رمیش پوجاری کی دو لڑکیاں ہیں دونوں پوسٹ گریجویٹ، رنگ روپ ناک نقشہ کوئی خاص نہیں ہونے کی وجہ سے شادی نہیں ہو رہی ہے۔ رمیش کو اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ جہاں رشتہ کی بات کچھ بنتی ہے تو جہیز کا مطالبہ رکاوٹ بن جاتا ہے۔ پچاس لاکھ روپے ایک لڑکی کے لیے بولی لگ رہی ہے رمیش کے پاس اتنا روپیہ کہاں؟ اس غم میں وہ گھٹ گھٹ کر مر رہا ہے۔

اور روی شنکر؟

روی شنکر کی کوئی اولاد نہیں۔ خوش طبیعت ہے مگر بیوی کینسر کی مریض اس لیے کافی پریشان زندگی گزار رہا ہے۔

اور اعجاز صدیقی ؟

ان کے تین لڑکے ہیں اور کوئی لڑکی نہیں۔ اعجاز صاحب کی اپنی ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی دولڑکے کمانے لگے تو انہوں نے اپنے رشتہ میں بھوپال میں دونوں لڑکوں کی شادی کر دی۔ تیسرا لڑکا B.E. کیا ہوا تھا۔ امریکہ میں اچھی جاب مل گئی اس نے امریکی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی اپنے ماں باپ کی اجازت لینا بھی گوارہ نہیں کیا۔ امریکی لڑکی سے شادی گرین کارڈ کا لالچ تھا، صدیقی صاحب کو اس بات کا کوئی افسوس نہیں تھا مگر فکر اس بات کی تھی وہ امریکی لڑکی نے اسلام قبول کیا؟ مسلمان ہوئی اور نکاح ہوا کہ نہیں؟ صدیقی بھائی کے لڑکے نے اب تک اس بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا۔

سب جگہ اندھیرا ہے! روشنی کی تلاش سب کو ہے انور بھائی، یہ تصویر ہماری سامنے ہے ہمیں فیصلہ کرنے کا اختیار بھی نہیں! تصویر کے رنگ گہرے ہوتے جارہے ہیں۔ ہم اس نئی نسل کو ایسا ہی چھوڑ دیں اور چلے جائیں؟

اس کا جواب انور ناٹیکر کے پاس نہیں! اور شاید میرے پاس بھی نہیں!!


## مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں

بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں ''مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا جیسا پایا'' اور ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، ''مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا'' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگا رنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ پروفیسر وحید اختر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، مشفق خواجہ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انتظار حسین، پروفیسر شمیم حنفی، فکر تونسوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شہریار، یوسف ناظم، مرزا ظفر الحسن، پروفیسر یوسف سرمست، رفعت سروش، پروفیسر بیگ احساس، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، علی باقر، کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو ''جیسا دیکھا جیسا پایا'' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کئی شعراء نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ، محمد علی صدیقی، علی باقر، عارف حسینی، بلراج ورما اور نقی علی کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز و مزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر قمر رئیس، جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، رضیہ فصیح احمد، مصحف اقبال توصیفی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، علی ظہیر، حسن چشتی، ڈاکٹر افسر کاظمی، زاہد علی خاں، من موہن تلخ، انور سدید، مخمور سعیدی، ڈاکٹر مظفر حنفی، علیم صبا نویدی، قمر علی عباسی، مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں بے باکانہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی، کمار پاشی، رشید انصاری، حامد اکمل، طاہر مسعود، فیروز عالم، حلیمہ فردوس اور کئی باریک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔ دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔ کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس 3108 وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

رؤف خیر

خراج عقیدت

# کھلی کتاب قدیر زماں

شعروادب میں کلیات شائع کرنے کی روایت کوئی نئی نہیں ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ وغیرہ وغیرہ کی کلیات اسی طرح نثر میں بھی کلیات شائع ہونے لگی ہیں جیسے منٹو کی کلیات یعنی منٹو کے تمام افسانے، افسانچے اور خاکوں پر مشتمل کلیات ایک سے زائد جلدوں میں دستیاب ہے۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے تخلیقات کے انتخاب بھی شائع کیے گئے ہیں۔ شعری یا نثری ANTHOLOGIES بھی اسی سلسلے کی کڑی ہوتی ہیں جن میں مختلف شاعروں کو یا منتخب نثر نگاروں کی یا چند افسانہ نگاروں کی ..... نمائندہ یا موضوع سے متعلق تخلیقات یک جا کر دی جاتی ہیں۔

کھلی کتاب دراصل جناب قدیر زماں کی نمائندہ تحریروں کا انتخاب ہے۔ جس میں وہ خود ایک کھلی کتاب کی صورت جلوہ گر ہیں۔ یہ کھلی کتاب ہر زندہ موضوع پر جناب قدیر زماں کی فکر سے روبرو کرتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو اپنے مخاطب پر مسلط نہیں کرتے یا منوانے کی ضد نہیں کرتے بلکہ انتہائی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مجھے جو کہنا ہے کہوں گا اور مرتے دم تک آپ کے کہنے کے حق کو تسلیم کرتا رہوں گا۔''

ہمارے بعض ایسے دوست احباب بھی ہیں جو مسلسل بولتے رہتے ہیں اور ہم سے ایک جملہ بھی سننے کے روادار نہیں ہوتے حتیٰ کہ فون پر بھی اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک سوال کرتے ہیں اور ہم سے جواب سننے کے بجائے خود ہی مختلف امکانی جوابات دے لیا کرتے ہیں اور ہم منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ عموماً وکیل کو دیکھا گیا ہے کہ وہ حزبِ مخالف کو بولنے کا موقع ہی دینا نہیں چاہتا مبادا اس کی بات رد ہو جائے۔ جناب قدیر زماں وکیل ہونے کے باوجود دوسرے کے بولنے کا حق بھی تسلیم کرتے ہیں تاکہ اور بھی اچھی طرح مدلل رد کیا جا سکے۔ یہی خوبی جناب قدیر زماں کو مہذب ادیب قرار دیتی ہے۔ ہر شخص کو اختلاف کا حق بھی تو حاصل ہے۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ جناب قدیر زماں اعتراف کرنے پر آتے ہیں تو کھلے دل سے اعتراف بھی کرتے ہیں۔ وہ بہار کے افسانہ نگار عبدالصمد کی ایک کہانی ''اعتراف'' کی داد بڑی فراخ دلی سے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ان کی ساری کہانیاں لے لے اور یہ کہانی انہیں دے دے۔ جس طرح غالبؔ نے مومنؔ کا ایک شعر:

تم مرے پاس ہوتے ہوئے گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سن کر کہا تھا کہ مومنؔ ان کے سارے دیوان کے بدلے انہیں یہ شعر دے دیں۔

کھلی کتاب جناب قدیر زماں کی منتخب تحریروں کا انتخاب ہے، مگر میں اسے اک ایسا البم سمجھتا ہوں جس میں ان کے فکر وفن کا لمحہ بہ لمحہ ارتقا دکھائی دیتا ہے۔

جناب قدیر زماں کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اردو ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ فارسی اور عربی کے معاملے میں وہ ''اہل ذکر'' سے رجوع کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ وہ کسی بھی مرحلے پر خود رائی (DOGMATISM) سے کام لیتے دکھائی نہیں دیتے۔

''کھلی کتاب'' میں کسی ایک موضوع میں وہ بند ہوکر نہیں رہ گئے ہیں۔انشائیہ ESSAY کی ماہیت اوراس کی پوری تاریخ بیان کرکے رکھ دی۔فرانسیسی ادیب میکل ڈی مون ٹین MACHEAL DEMONTAIGN کے ساتھ ساتھ شہنشاہ اکبر کے نورتن ابوالفضل کے فارسی میں لکھے رقعات کے بارے میں لکھا کہ یہ انشائیوں کی اولین مثالیں ہیں۔ جناب قدیر زماں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تازہ تحقیق کے مطابق محمد حسین آزاد کے نیرنگ خیال انشائیے دراصل انگریزی انشائیوں کے تراجم ہیں۔یہ سلسلہ ''سوئے انشائیہ'' ہوتا ہوا رپورتاژ، کالم نگاری، خاکہ نگاری تکپہنچا۔انہوں نے ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کے مایہ ناز قلم کار مرزا فرحت اللہ بیگ کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین، وزیر آغا، انور سدید، عطاء الحق قاسمی، طاہر مسعود اور مشفق خواجہ کا بھی ذکر کیا ہے۔مشفق خواجہ کے کالموں پر تو پوری کتاب ہی لکھی جاسکتی ہے، جنہوں نے کہا تھا کہ بھلے ہی دوست ضائع ہوجائے وہ اچھا فقرہ ضائع ہونے نہیں دیتے۔

چونکہ جناب قدیر زماں کو ڈرامہ اور تھیٹر سے دلی لگاؤ ہے، انہوں نے تھیٹر آف البسرڈ کی اصطلاح اوراس کے نمائندہ فن کاروں اور قلم کاروں کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ جیسے فرانز کافکا (1883-2008) سام شیفرڈ (1943) یوجین آئنسکو (1912-1994) ایڈورڈ البی (1928) سیموئل بیکٹ (1906) وغیرہ کا تعارف اوران کے کارناموں کا اجمالی جائزہ جو پیش کیا اس سے جناب قدیر زماں کے تلاش وتجسس کا اندازہ ہوتا ہے۔

علامہ اقبال سے دل چسپی دکھانے والوں کا یہ عالم ہے کہ:

بدعتی اور خبیث بھی خوش تھے
ان سیاہلِ حدیث بھی خوش تھے

جامعاتی سطح پر اقبال کو پڑھنا پڑھانا ایک خوش گوار فریضہ ہوکر رہ گیا ہے۔منٹو کی زبان میں علامہ اقبال کو رحمۃ اللہ کی کھونٹی پر ٹانگ دیا گیا ہے۔علامہ اقبال تصوف کے خلاف تھے مگر انہیں ''جاوید نامہ'' کے حوالے سے صوفی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اہل حدیث حضرات کو اگر یہ معلوم ہوجائے کہ اقبال تو جنت ودوزخ کے قائل ہی نہیں تھے تو شاید ان کے شعر سنانا چھوڑ دیں۔ جناب قدیر زماں بھی ''تلاشِ اقبال'' میں نکلتے ہیں۔اس سفر میں وہ عالم خوندمیری کے نقش قدم پر چلتے ہوئے امام غزالی، رومی، افلاطون، نطشے، مارٹن بوبر وغیرہ تک پہنچتے ہیں۔اقبال کے ہم عصر یہودی فلسفی مارٹن بوبر اور اقبال کے نظریات کے تقابلی جائزے پر مبنی اپنا مقالہ داخل کرکے امریکہ کی پورڈے یونیورسٹی سے یاسمین لودھی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس کا پتہ کھلی کتاب سے چلتا ہے۔ جناب قدیر زماں علامہ اقبال کی فلسفیانہ حیثیت کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔انہوں نے فاطمہ نوید مرزا کے نام اپنے خطوط میں اقبال کے تعلق سے اپنی تحقیقات پیش کرتے ہوئے ایک نیا انداز اختیار کیا تھا، مگر پروفیسر مغنی تبسم نے تبصرہ کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری کے پردیسی کے خطوط کی لڑکی اور میراں جی شمس العشاق کی مرید لڑکی ''خوش'' کے نام خوش نامہ وخوش نغز کا ذکر کر ڈالا۔قدیر زماں نے اقبالیات کے سلسلے کا پہلا خط جب ۱۹۸۶ء میں لکھا تھا وہ لڑکی فاطمہ تیرہ برس کی تھی اور آخری خط ۱۹۹۹ء میں لکھا۔گویا اقبال کو سمجھنے سمجھانے کا سلسلہ تیرہ برس تک چلتا رہا۔جس میں انہوں نے ماہرین اقبالیات کے ارشادات سے استفادہ کیا۔

جناب قدیر زماں ''کھلی کتاب'' کھلے طور پر لکھتے ہیں کہ ''ادب کا کینواس'' مذہب کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''مذہب کتنا ہی وسیع النظر سہی ایک مقام پر پہنچ کر اپنی

کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیتا ہے۔ فلسفے میں بھی مذہب کے کسی بھی تصور پر بحث کی گنجائش ہے لیکن مذہب ایقان کی بدولت اپنے حدود مقرر کر چکا ہے۔''

یہاں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں اجتہاد کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چار فقہی مکاتب حنفی، شافعی، مالکی و حنبلی موجود ہیں۔ جناب قدیر زماں نے اصغر علی انجینئر سیفقہ و شریعت کا فرق دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ:

''فقہ کہتے ہیں کسی مسئلے کو اچھی طرح سمجھ کر قانون بنانے کو اور شریعت نام ہے اس عمل کے ذریعہ بنائے ہوئے قانون کا جسے ہم اسلام کی اصطلاح میں شریعت یا شرعی قانون کہتے ہیں بشرطیکہ اس تفقہ کا تعلق احکامات قرآنی سے ہو۔''

جہاں تک ہم سمجھتے ہیں شریعت کا دار و مدار صرف اور صرف کلام اللہ اور سنت رسول اللہ پر ہے۔ یہی منہج سلف ہے۔ یہ شرعی حدود ہی تو ہیں جو مسلمان کو ادھر ادھر بھٹکنے سے بچاتے ہیں۔ ادب کا کینواس کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو اس کے بھی حدود LIMITATIONS ہیں۔ حمد و نعت کو خلط ملط نہیں کر دیا جا سکتا، غزل میں وزن بحر، قافیہ و ردیف کا بہ ہر حال خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ماہیے، ہائیکو، ترائیلے، سانیٹ، رباعی، قطعہ، قصیدہ، مرثیہ کے اصول و ضوابط طے ہیں، ان سے سرمو انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب میں آزادہ روی تہتر (۷۳) فرقے بناتی ہے تو ادب میں ادب کے نام پر الا بلا لکھواتی ہے۔

جناب قدیر زماں کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر موضوع کو بہتر سے بہتر انداز میں جاننے کے خود جتن کرتے ہیں۔ اپنی آنکھوں پر دوسروں کے چشمے لگا کر کسی چیز کو دیکھنا نہیں چاہتے۔ جیسے تصوف بھی ان کے لئے کوئی شہر ممنوع نہیں ہے۔ وہ اس کی بھی سیر کر کے اپنے تاثرات پیش کرنے میں تامل و تکلف سے کام نہیں لیتے۔ چونکہ علامہ اقبال کی تلاش میں بھی وہ نکلے تھے، انہیں پتہ تو ہوگا ہی کہ اقبال نے تصوف کے خلاف بہت سارے نوٹس جمع کیے تھے جو ''تاریخ تصوف'' کے نام سے ۱۹۱۶ء میں لکھے گئے تھے۔ مگر گوشۂ گم نامی میں پڑے رہے۔ ۱۹۸۵ء میں کراچی کے پروفیسر صابر کلوروی نے اپنے حاشیوں کے ساتھ انہیں شائع کیا۔ تاریخ تصوف کا پس منظر بیان کرتے ہوئے صابر کلوروی صاحب نے بتایا کہ اقبال نے ۱۹۱۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ''عجمی تصوف اور اسلام'' کے موضوع پر خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ مروجہ تصوف خودی کو مٹانے کی تلقین کرتا ہے جو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اقبال نے اسرارِ خودی میں پہلے چونتیس اشعار کا بند حافظ شیرازی کے خلاف لکھتے ہوئے اسے گوسفندی مسلک کا نمائندہ قرار دے کر اس کے زہریلے اثرات سے بچنے کی تلقین کی تھی۔ سید فصیح اللہ کاظمی کے نام خط محررہ ۱۴ جولائی ۱۹۱۶ء کو علامہ اقبال نے لکھا تھا:

''تصوف کے متعلق میں خود لکھ رہا ہوں۔ میرے نزدیک حافظؔ کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا ہے۔ اسی واسطے میں نے ان کے خلاف لکھا ہے۔ مجھے امید تھی کہ لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں دیں گے۔ لیکن میرا ایمان گوارا نہیں کرتا کہ حق بات نہ کہوں۔ شاعری میرے لیے ذریعہ معاش نہیں کہ میں لوگوں کے اعتراضات سے ڈروں.....''

لیکن جب خواجہ حسن نظامی جیسے لوگوں نے ان کا پیچھا کیا تو اقبال نے حافظؔ کے خلاف لکھے چونتیس اشعار دوسرے ایڈیشن سے نکال دیئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ایسی بحثوں میں الجھنے سے ان کا فلسفۂ خودی مجروح ہو جائے گا۔

جناب قدیر زماں نے تصوف کے موضوع پر بھی دادِ

تحقیق دی اور بتایا کہ شیخ ابوبکر الجزائری خطیب مسجد نبوی نے فرمایا:

تصوف یا تو عین اسلام ہے یا غیر اسلام۔ عین اسلام ہے تو ہمارے لئے اسلام ہی کافی ہے۔ غیر اسلام ہے تو اس کی ضرورت نہیں۔''

''تصوف- رجحان یا تحریک'' لکھتے ہوئے قدیر زماں نے جو کتابیات کے حوالے دئے ہیں ان میں علامہ اقبال کی ''تاریخ تصوف'' اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی کتاب ''تصوف میں غیر اسلامی عناصر کی آمیزش کا ذکر نہیں ہے۔ ان کے علاوہ لگتا ہے محمد افضل احمد کی کتاب ''تصوف ایک باطل مذہب'' بھی ان کی نظر سے نہیں گزری۔

جناب قدیر زماں کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے محترم شمس الرحمٰن فاروقی کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ایک سوانحی ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کی تلخیص ''وزیر خانم'' کے نام سے صرف 224 صفحات میں پیش کردی اور بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کی۔ قاری وزیر خانم سے تسکین پا جاتا ہے، اسے ہفت خواب طے کرنے کے لیے سر آسماں جانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ ویسے ہمارا خیال ہے کہ تلخیص کسی بھی فن پارے کی توہین ہے۔ کامیاب تلخیص تو توہین مزید ہے۔ چونکہ جناب قدیر زماں نے انگریزی ادب کی بعض اہم تخلیقات کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے، ''اردو ترجمہ- آداب و مسائل'' پر ان کا مکالمہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔

جناب قدیر زماں بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیاں علامتی ہوتی ہیں، جیسے بچپن میں معمولی سی بات پر ایک لڑکے سے مکہ کھا کر خون تھوکنے والے لڑکے کا ایک دانت بھی جب خون کے ساتھ گر پڑتا ہے تو اس کی ماں اس سے کہتی ہے کہ یہ اس کا ''دودھ کا دانت'' تھا۔ گویا اب اسے مکے کا جواب مکے سے دینا ہے۔ آقا کو چھرا گھونپنے کی نیت سے آنے والا خود شکار ہو جاتا ہے مگر اخلاق ہتھیار کا جو اس کے لیے ''ہیرے کا زخم'' ثابت ہوتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے پس منظر میں ایک کردار خودکشی کر لیتا ہے جو ''مانس گنڈ'' کی بنیاد ہے۔ احتجاج کرنے والے کے کانوں میں سیسہ پلا کر ڈالا جاتا ہے۔ اس کہانی کا ملیالم میں ترجمہ ہوا۔ چلتے چلتے ٹرین پٹری سے اتر گئی اور مسافروں کے اندیشوں کا خاطر خواہ تدارک نہیں ہو پاتا ہے۔ یہی زیر اور کا بنیادی خیال ہے۔ زندگی کی گاڑی کی علامت کہانی کے کرداروں کے چہروں سے نقاب اتارتی ہے۔ ایسی ہی علامتی کہانیوں کے خالق جناب قدیر زماں ہر بے انصافی کے خلاف احتجاج کی ہمت رکھتے ہیں، وہ توہین عدالت (CONTEMPT OF COURT) کے اندیشے کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ''حق گوئی و بے باکی'' اگر صرف ایک کہانی ہے تو اس کہانی کا زندہ کردار قدیر زماں رہے ہیں۔ افسوس کہ ۲۱ جنوری ۲۰۱۸ء کو ایسے خوش کردار ادیب سے اردو ادب محروم ہو گیا۔

☆☆☆


## سب رس انٹرنیٹ پر

Sherosokhan.net پر پہلے صفحے پر اوپری جانب انگریزی سرخیوں میں ''برقی کتب'' کے عنوان پر کلک کرنے پر ''سب رس'' کے شمارے پڑھے جا سکتے ہیں۔ صفحہ اول پر ہی ایک نشان ''سب رس'' کا ہے اس پر کلک کر کے تازہ شمارہ پڑھا جا سکتا ہے۔

# جو وہ لکھیں گے جواب میں

**محترم بیگ احساس صاحب ____ سلام ورحمت!**

ساہتیہ اکادمی کے وقیع اعزاز کے لیے مبارک باد قبول فرمائیں۔

**کوثر صدیقی۔ بھوپال**

---

**برادر محترم!**

کئی ،فنون ہر بار بات کرنے کی کوشش کی نا کامی رہی۔ بہر حال ساہتیہ اکادمی کا انعام مبارک ہو۔ حالاں کہ آپ کا نام اور کام ان سب سے بالاتر ہیں تاہم خوشی تو ہوتی ہی ہے۔ کم از کم مجھے حیدرآباد کی بریانی تو کھانے کو مل جائے گی۔ دیکھئے کب حیدرآباد آنا ہوتا ہے۔

**علی احمد فاطمی۔ الہٰ آباد**

---

**محترمی!**

''دخمہ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہو رہا تھا کہ اس کتاب کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے لیے ضرور نام زد کیا جانا چاہیے۔ اب جب کہ آپ کا افسانہ نگاری کی خدمت کا اعتراف یہ ایوارڈ دے کر کیا گیا ہے، میری طرف سے تہہ دل مبارک باد قبول کیجیے۔ ''سب رس'' برابر موصول ہو رہا ہے۔ اور صوری طور پر ہی نہیں، معنوی لحاظ سے بھی بہتر ہو رہا ہے۔ بس پروف ریڈنگ پر مزید دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

**اسیم کاویانی۔ ممبئی**

---

**جناب بیگ احساس صاحب.... سلام مسنون!**

سب سے پہلے تو ساہتیہ اکادمی کا انعام ملنے کی مبارک باد قبول کریں۔ اس خوشی میں برابر کا شریک ہوں۔ دی ہندو اخبار میں آپ کا تعارف پسند آیا۔ سب رس آتا ہے تو سب سے پہلے آپ کا اداریہ پڑھتا ہوں جو مجھے بے حد پسند آتا ہے۔ دل سے نکلی ہوئی بات دل کو چھو جاتی ہے۔ اس کے بعد راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر کی یادیں (آپ بیتی) پڑھتا ہوں جس میں اکثر نسوانی احساس کا خوب صورت اظہار پڑھنے کو ملتا ہے۔ مجھے سب رس کی سنجیدگی پسند ہے۔

**نسیم محمد جان۔ پٹنہ**

---

قابل قدر احترام محترم پروفیسر بیگ احساس صاحب--- سلام مسنون!

ادبی اخبار اردو ہلچل، بھوپال میں یہ خوش کن خبر پڑھنے میں آئی۔ اس بار اردو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ آپ کو دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس خبر کے پڑھتے ہی دل خوشی سے بھر گیا اور ہونٹوں پر یہ دعا خود بخود ابھر آئی کہ تمام قابل ذکر اعزازات آپ کے نام کے ساتھ یوں ہی جڑتے چلے جائیں۔ آمین ثم آمین!

اس ایوارڈ پر میری دلی مبارک باد قبول فرمائیں!

حالاں کہ ایک غزل کا مقطع ابھی ابھی کہا ہے

دل بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کوشش کو بھی آپ کے سپرد کریں، اگر کوشش کامیاب ہوگی تو کبھی نہ کبھی 'سب رس' کے کسی صفحے پر نمودار ہو ہی جائے گی۔ مگر اس خوشی کے موقع پر مبارکباد کے ساتھ غزل کی ہمر ہی مناسب نہیں لگی۔ پھر بھی غزل کا مطلع ملاحظہ فرمائیں۔

بچوں کے مکانات کی تعمیر میں گم ہیں
ہم اپنے حسیں خواب کی تعبیر میں گم ہیں

**شارق عدیل۔ ایٹہ، پٹنہ**

---

**محترمی پروفیسر بیگ احساس صاحب..... سلام مسنون!**

سب سے پہلے تو آپ کی خدمت میں ملک کے پُر وقار اعزاز' ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے اعلان پر دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ یہ اعزاز نہ صرف آپ کے لیے بلکہ ہر اردو داں اور خود اردو زبان کے لیے قابل فخر امر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی بے شمار رحمتوں سے سرخرو اور سرفراز کرے۔ آمین!

**کشور سلطانہ۔ حیدرآباد**

---

**پروفیسر بیگ احساس صاحب ــــــ تسلیم!**

فروری کا 'سب رس' میز پر رکھا ہوا ہے۔ سب رس کا سر ورق رات کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ سورج لال ٹکیہ بن کر تاریکی کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظلمت کدے میں دور ایک عمارت بھورے رنگ کی اپنے وجود کا احساس دلا رہی ہے۔

آپ کا اداریہ وقت کی ایک جلتی ہوئی بحث رانی پدماوتی کے اردگرد چکر لگا رہا ہے۔ آپ نے علاء الدین خلجی اور پدماتی کے رومانس کو یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا ہے کہ اس واقعہ کا ذکر امیر خسرو اور ضیاء الدین برنی نے اپنی تصانیف میں نہیں کیا ہے۔

خسرو 1303ء میں چتوڑ گڑھ پر علاء الدین خلجی کے حملہ کے وقت لشکر میں سپاہی کی حیثیت سے موجود تھے۔ انہوں نے مثنوی ''خزائن الفتوح'' لکھی۔ اس میں اشارے کنائے درج کیے اور استعاروں میں محبت کی کیفیات کا ذکر کیا ہے۔ قلعہ تسخیر کر لیا جاتا ہے۔ پدماوتی علاء الدین کے ہاتھ نہیں لگتی۔ وہ اپنی کنیزوں کے ہمراہ جوہر کی رسم ادا کرتے ہوئے جان دے دیتی ہے۔ ضیاء الدین برنی کا پورا خاندان اور اس کے افراد علاء الدین کے درباری تھے۔ وہ مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ برنی کا قلم سلطان کے جلال و جبروت سے لرزہ براندام تھا۔ کیا مجال کے وہ ایسی گستاخی کر بیٹھتا۔ پدماوتی کی سچائی تو ایک ولی، صوفی سنت ہی کہہ سکتا ہے۔ اسے خوف دنیا نہیں خوف عقبیٰ تھا۔ وہ قصہ جو سارے میواڑ اور سارے چتوڑ گڑھ میں گلی گلی، کوچہ کوچہ ہر مرد و زن کی زبان پر تھا۔ وہ عوام کی قومی یادداشت کا حصہ بن گیا تھا۔ اس مقبول ترین واقعہ ہی کو ملک محمد جائسی نے پدماوت کے نام سے منظوم کیا۔ جائسی کی تخلیق دو سو پچاس برس کے بعد منظر عام پر آئی۔ 1540ء یعنی شیر شاہ سوری کا زمانہ تھا۔ وقت کے فاصلے سے کتاب کی اہمیت میں کمی نہیں ہوتی۔ ویدوں کو صدیوں بعد مرتب کیا گیا۔ رامائن سینکڑوں برس بعد لکھی گئی۔ سرکار دو عالمؐ کے وصال کے کئی سال بعد احادیث یکجا کی گئیں۔ صدیوں بعد نئی بائبل New Testament قدیم انجیل مقدس Old Testament کے بعد تدوین کی گئی۔ بادشاہوں کی موجودگی میں ایسے واقعات کو قلم بند کرنا قید و بند کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اسی لیے مورخین اپنی جان بچانے کے لیے بہت سے حقائق سے جان بوجھ کر اغماز کیا کرتے تھے۔ فیروز تغلق نے برنی کو تمام مراعات سے محروم کر دیا تھا۔ وہ ۷۳ یا ۷۴ سال کی عمر میں افلاس و نکبت کی حالت میں مرا۔

لوگ گیت، روایتیں، قصص Legends تاریخ کا

نامیاتی حصہ ہوتے ہیں۔سارے راجپوتانے میں پدماوتی ایکLegendary رجکماری رہی ہے۔ راجستھان کا بچہ بچہ اس کہانی سے واقف ہے۔وہ Popular Culture ہے۔ ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہرلعل نہرو نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تلاش ہندیعنیDiscovery of India میں پدمنی اورعلاءالدین خلجی کے معاشقہ کا تذکرہ فرمایا ہے۔مشہور بائیں بازو والے ہدایت کار شیام بنیگل نے ایک ٹی وی سیریل بھارت ایک کھوج بنایا تھا جسے دور درشن سے ٹیلی کاسٹ کیا گیا تھا جو بہت مشہور ہوا تھا۔ اس سیریل کے26ویںEpisode میں علاءالدین خلجی کے عشق کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ ساری تفصیلات ہیں جس پرحالیہ دنوں میں راجستھان میں ہنگامے ہوئے۔تعجب تو اس امر پر ہے کہ یہ احتجاج یہ گڑبڑی ٹی وی سیریل کے خلاف کیوں نہیں کی گئی۔اس وقت چپ کیوں سادھ لی گئی۔ شاید اس سمئے مرکز اور ریاست میں کانگریس کی سرکارتھیں۔آج مرکز اورراجستھان میں بی جے پی کی حکومت ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ ایک مسلمان بادشاہ کے آگے ایک ہندو رانی رقص کرے، گانا گائے،سلطان کی برتری دکھلائی جائے۔اکیسویں صدی کی عینک سے تیرھویں و چودھویں صدی کی سیاسی، ثقافتی،فوجی،سماجی، زندگی اور ماحول کو پرکھنے کی کوشش کرنا کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔علاءالدین خلجی ایک سچا عاشق بھی تھا۔اس نے گجرات کی رانی کملا دیوی سے شادی کی ۔اپنے بیٹے خضرخاں کی شادی کملا دیوی کی بیٹی دیول دیوی سے کراوئی۔امیر خسرو نے دونوں کی ایک مثنوی لکھی ہے۔خلجی ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اکبراعظم نے امبر کی راجکماری سے شادی کی اسے اپنے حرم میں داخل کیا۔اس رانی کا نام وقت کی بھول بھلیوں میں کھو گیا ہے۔اس کا خطاب مریم مکانی رہ گیا۔نام گم ہوگیا۔کسی مورخ نے بھی اس کے آبائی نام کو اپنے شذرات میں مذکور نہیں کا۔جودھابائی جہانگیر کی بیگم کا اسم مبارک تھا۔

ملک میں سیاسی فاشزم کے ساتھ ساتھ ثقافتی فاشزم Cultural Facism کی یورش بڑھ رہی ہے۔یہ لوگ اظہارخیال کی آزادی کا خاتمہ چاہتے ہیں۔مسلم فرمانرواؤں کے خلاف زہرافشانی کرنا ان کا روزمرہ کا معمول ہوگیا ہے۔انہیں کیا پتہ کہ محمد بن تغلق،شاہجہاں،قلی قطب شاہ کی ماں ہندو تھی۔انہیں کیا خبر کے اورنگ زیب،علاءالدین خلجی ابراہیم قلی قطب شاہ کی بیوی ہندو تھی،ان نفرت کے سوداگروں کو کیا معلوم کہ مڈگل میں ایک سنار کی لڑکی کے حصول کے لیے بہمنی سلطنت کے بادشاہ فیروز بہمنی اور رائل سیما کے راجہ دیورائے کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دونوں بھی کف افسوس ملتے رہے۔وہ خوب صورت کافرہ گاؤں سے فرار ہوچکی تھی۔تاریخ ہندو مسلمان نہیں انسانی وبشریاتی ہوتی ہے۔

**مسعود جعفری۔حیدرآباد**

---

**مکرمی بیگ احساس صاحب____السلام علیکم!**

آپ کے حق میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے اعلان سے بڑی مسرت ہوئی میری طرف سے اس گراں قدر اعزاز کے لیے مبارک باد قبول فرمائیے۔

**احسن رضوی۔لکھنؤ**

---

**مکرمی بیگ صاحب.....سلام مسنون!**

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے لیے دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

**جنوں اشرفی۔پٹنہ**

ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے 12 تا 17 فروری 2018ء "ساہتیہ اتسو" Festival of Letters منایا جس میں ایوارڈ یافتہ فن کاروں کے بڑے بڑے پینل تعارف کے ساتھ لگائے گئے۔ اپنے پینل کے پاس پروفیسر بیگ احساس

Regd No. H-HD 970-2015-2017 RNI No. 10922-57

# THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-03 March, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

سیاست

حیدرآبادی دور،
ثقافت اور طرز زندگی کا
مصدقہ عکاس!

سیاست آج ملک کے موقر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ سیاست نے دیگر ممالک میں بسے ہوئے اردو قارئین کی روز مرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روزانہ بذریعہ طیارہ مشرق وسطی، یو کے، یو ایس اے اور کینیڈا ترسیل عمل میں آتی ہے۔

...اور وہ حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، سیاست کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، ذائقہ اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائٹ جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ ہٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے روز بان سے واقف قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کرکے ایک بار پھر بطور روزنامہ اپنی مقبولیت کو ثابت کر رہا ہے۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : 24744180, 24603666, 24744109, 24744114
Fax : Editorial : 040-24603188, Advertisement : 24610379
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام سیاست

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469